گورکی کے
افسانے

مترجمہ

سعادت حسن منٹو

کتاب منزل لاہور

گورکی کے افسانے

مترجمہ

سعادت حسن منٹو

گوشۂ ادب لاہور

ناشران

حافظ محمد دین اینڈ سنز تاجران کتب کشمیری بازار

لاہور

(جملہ حقوق محفوظ)

بار اوّل سنہ ۱۹۴۶ء قیمت عہ

ترتیب

مقدمہ ۷

میدانوں میں ۳۹

چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ ۶۵

خان اور اس کا بیٹا ۹۳

غزال کی ایک رات ۱۰۹

مقدمہ

۱۸۸۰ء سے لیکر ۱۸۹۰ء تک کا درمیانی زمانہ بخصوص عظیم ہے، روس کی ادبی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتا ہے، دستوفیسکی ۱۸۸۱ء میں تشنگان ادب کو پیاسا چھوڑ گیا۔ تورگنیف ۱۸۸۳ء راہیِ ملکِ عدم ہوا اور طالسطائی کچھ عرصہ کے لئے مناہانہ تصانیف سے روکش رہا۔ اور جب اُس نے اپنا قلم اُٹھایا تو "انیا کرینینا" اور "جنگ و امن" کے مصنف نے بالکل جدا اسپرٹ میں اپنے افکار کو پیش کیا۔ اسی دوران میں روسی معاشرت کی تبدیلیاں نمایاں طور پر ظاہر ہو گئیں ۱۸۶۳ء میں غلاموں کی آزادی کے بعد ملک کی صاحب اقتدار جماعت نے رفتہ رفتہ معاشی اور سیاسی اہمیت سے کنارہ کشی کر لی تھی؛ بیشتر پروپرائیٹر قریب قریب تباہ ہو چکے تھے، اور اُن کی جائیداد تاجروں کے ہاتھوں میں جا رہی تھی۔

الگزینڈر سوئم (۹۴ - ۱۸۸۱) کا عہدِ حکومت اور نکولس دوئم (۱۹۱۷-۱۸۹۴) کی حکمرانی کے پہلے چند سال، روس کے اندرونی سیاسیات کا بدترین زمانہ تھا، جذبۂ اصلاح کا وہ جوش جو الگزینڈر دوم کے عہد میں روسی معاشرہ کی رگوں میں موجزن تھا، سب ختم ہو چکا تھا۔ مہذب روسی معاشری سوالات سے دور ہٹ کر صرف ذاتی معاملوں پر غور کرتے تھے، دوسری طرف انیسویں صدی کے آخری سالوں میں مصنوعات نے بڑی ترقی کی اور بیشتر کسانوں نے کارخانوں کی مزدوری اختیار کر لی، یہ کسان اپنا گھر بار چھوڑ کر شہروں میں آباد ہو گئے مگر پھر بھی انکا اپنے دیہاتوں سے تعلق قائم رہا۔ جہاں وہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ملک میں خانہ بدوش مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ مزدوروں کی یہ جدید جماعت مارکس کے اشتراکی پروپیگنڈے کے لئے بہت موزوں تھی جو بعد میں روسی انقلاب کی متحرک ہوئی۔

دو مصنف روس کے اس متغیر معاشری نظام کی تصویر کشی کرتے ہیں یہ چیخوف اور گورکی ہیں۔

چیخوف کی وفات سے قبل یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تصانیف نے حقیقت نگاری کے سنہرے زمانے کا افتتاح کیا ہے، جس کا وہ انجام کار صرف پیش آہنگ تھا۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۵ء کے درمیانی عرصے میں بہت سے نوجوان ادیب یکے بعد دیگرے روسی فضا میں ابھرے، ان ادبا نے مقامی شہرت حاصل کرنے کے علاوہ اکناف عالم میں اپنے نام کا ڈنکا بجوایا۔ دوستووسکی اور تورگنیف سے کہیں بڑھ کر ان کو

مقبولیت حاصل ہوئی ان میں گورکی اور انیدریف کا نام خاص مرتبہ رکھتا ہے۔ ہم اس عصر کے ادیبوں کی اجتماعی سرگرمیوں کو "گورکی۔ انیدریف سکول" کہیں گے، اس لیے کہ وہ تمام انشاپرداز جو اس سکول میں شامل تھے، ایسی مشترکہ خصوصیات رکھتے ہیں جو افسانہ نگاری کے قدیم "پری چیخوف سکول" سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں۔

جس سکول کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس میں گورکی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے ہمیں اس سکول کے اکثر اراکین کی تحریروں پر اس کے افکار کا اثر جابجا نظر آتا ہے، اس اثر کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ گورکی ہی پہلا شخص تھا جس نے روسی حقیقت نگاری سے "ملائم" اور "مطہر" عناصر کو بیک قلم منسوخ کر دیا۔

روسی حقیقت نگاری، اخلاقیات کے معاملے میں ہمیشہ نرم و نازک رہی تھی روسی ادیب بشمول ٹالسٹوں کی خام اور حد سے متجاوز صاف گوئی سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے، بعد اپنی نجاست اور صنفی رشتوں کا شہوانی پہلو روسی مصنفین کیلئے شجر ممنوع تھا۔

یہ "ادبی معاہدہ" طالسطائی" نے منسوخ کیا جس نے پہلی مرتبہ موت اور بیماری کی جسمانی ہیئتوں کو اپنا موضوع قرار دیکر "ایوان ایلیچ کی موت" کے عنوان سے ایک تمثیل سپرد قلم کی اور محبت کے شہوانی پہلو کی "کروتزر سوناتا" کے اوراق میں نقاب کشائی کی۔ طالسطائی نے ان دو کتابوں کے تعارف سے فی الواقع انیسویں صدی کے ممنوعات اور اعتقادات کی بنیادیں قطعی طور پر ہلا دیں، وہ

کام جو طالسطائی نے شروع کیا تھا، گورکی، انیدریف اور آرتی بے شیف کے ہاتھوں تکمیل حاصل کرتا رہا، علاوہ بریں جدید آرٹ کا بانی ہونے کی حیثیت میں بھی طالسطائی کا اثر کافی دوافی تھا، افسانہ نگاری کے مافوق الطبعی اور اخلاقی مسئلے نے جو اُس کے زیرِ نظر تھا، انیدریف اور آرتی بے شیف کے ہاتھوں خوب نشوونما حاصل کی۔

ادب پر چیخوف کا اثر جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، ایک حد تک مختصر افسانہ نگاری کو روس میں مروج اور مقبول کرنے کا سہرا اُسی کے سر پر ہے، بیشتر نوجوان افسانہ نگاروں نے چیخوف کا چربہ اُتارنے، یعنی اُس کی صناعانہ "باریک روی" کو اپنانے کی کوشش کی، مگر اس فن میں اُسکا کوئی قدم مقابل نہ ٹھہر سکا۔ گو ہمیں ان نقال افسانہ نگاروں کی عبارت میں چیخوف کی دلپسند ترکیب اور اظہارِ خیال کا مخصوص طرز ملتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کی صنعت بیانی کو وہ لوگ ہرگز نہیں پہونچ سکے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیانی عرصے میں رُوسی ادب دو بالکل مختلف حصّوں میں تقسیم ہو گیا ۔ اولاً گورکی انیدریف سکول" ثانیاً سمبولسٹ اور اُن کے متبعین۔

"گورکی، انیدریف" قنوطیت اور منکریت کا علمبردار تھا، اور سمبولسٹ ایسے نئے کلچر کے مبلغ تھے، جس نے رُوسی اذہان کی خوب ربوبیت کی اور طبقۂ علمی کو بیک وقت یورپی اور قومی بنا دیا۔

رُوسی ادب کی حیاتِ تازہ میں میکسم گورکی کا نام بلند ترین مرتبہ رکھتا ہے۔ جدید انشاپردازوں میں صرف گورکی ہی ایسا ادیب ہے۔ جو طالسطائی کی طرح آفاقِ عالم میں مشہور ہے، اُس کی شہرت چیخوف کی مقبولیت نہیں جو دُنیا کے مختلف ممالک کے صرف علمی طبقوں تک محدود ہے۔

گورکی کا کردار فی الحقیقت بہت حیرت افزا ہے، غریب گھرانے میں جنم لینے کے باوصف وہ صرف تیس سال کی عمر میں رُوسی ادب پر چھا گیا۔

طبقۂ اسفل کا شاعر، بیسویں صدی کا بائرن ۔ میکسم گورکی، زندگی کی تاریک ترین گہرائیوں کے بطن سے، جو جرائم، مصائب اور بدیوں کا مسکن ہے، پیدا ہوتا ہے، اُس نے فقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا پھیلا کر روٹی کے ٹکڑے کے لئے التجا نہ کی، اور نہ جواہری کی طرح اپنے بیش قیمت جواہرات کی نمائش سے لوگوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرنا چاہی ۔ نہیں، تو ہیمنی نوگورود کا یہ معمولی باشندہ اپنے حرّیت پسند افکار سے رُوسی ادب کی اندھی شمع کو تابانی بخشنے کا آرزومند تھا، مردہ، زرد اور بے جان ڈھانچوں میں حیاتِ نو کی تڑپ پیدا کرنا چاہتا تھا۔

وہ منشی گری چھوڑ کر رُوس کی سرحدوں پر آوارہ پھرے ۔ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ مستقبلِ قریب کا شاندار ادیب اتنے عرصے تک دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہے خانہ بدوشی کی اس سیاحت کے زمانے میں گورکی نے اپنا قلم اُٹھایا ١٨٩٢ء میں جبکہ وہ طفلس کے ایک ریلوے ورکشاپ میں ملازم تھا، اُس کا پہلا افسانہ

Makoe Chudra جو ایک نہایت دلچسپ رومانی داستان ہے، مقامی روزنامہ اخبار "کوکاز" میں شائع ہوا. اس افسانے میں اُس نے خود کو اپنے قلمی نام گورکی سے متعارف کرایا جو اب ہر فرد و بشر کی زبان پر ہے (گورکی کے لفظی معنے کڑوا یا تلخ ہے)

کچھ عرصے تک گورکی اپنے صوبے کے اخباروں میں مضامین چھپوانے کے بعد اس قابل ہو گیا کہ اپنی تحریروں سے روپیہ پیدا کر سکے، مگر وہ درحقیقت اُس وقت اعلیٰ ادب کے ایوان میں داخل ہوا جب اُس نے دوبارہ نزہنی میں اقامت اختیار کی. کارلنکو[ا] ان دنوں نزہنی میں تھا۔ اُس نے گورکی کا افسانہ "چلکاش" اپنے اثر و رسوخ سے ایک مؤقر ماہانہ رسالے (Ruskoe Bogatstvo) میں شائع کرایا، گو میکسم گورکی نے پراونشل پریس کی قلمی اعانت جاری رکھی، مگر اب پیٹرزبرگ کے رسائل بھی اُسکے مضامین کو شکریے کے ساتھ شائع کرنے لگے .

ع ا ولادی میر کارلنکو جنوبی روس میں ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوا. روس کے دیگر ادبا کی طرح وہ حصولِ تعلیم میں سیاسی وجوہ کی بنا پر پریشان رہا، سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی وجہ سے اُسے ماسکو کے زراعتی سکول کو خیرباد کہنا پڑی. اُس نے چھ سال کا طویل عرصہ سائبیریا کے یخ بستہ میدانوں میں کاٹا. زمانۂ اسیری کے بعد وہ نزہنی میں اقامت پذیر ہوا. جہاں وہ عرصے تک ایک رسالے کی ادارت کے فرائض انجام دیتا رہا. اسی زمانے میں گورکی سے اُسکی ملاقات ہوئی. کارلنکو روسی ادب میں خاصی شہرت رکھتا ہے .

۱۸۹۸ء میں اُس کے افسانوں کا پہلا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ ان افسانوں کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی، فی الحقیقت ایک روسی انشاء پرداز کے لئے اس قسم کی شاندار کامیابی غیر مسبوق تھی، کہ کتاب کے تعارف کے ساتھ ہی گورکی غیر معروف جرنلسٹ سے ملک کا مشہور ترین ادیب بن گیا، اُس کی شہرت "پہلے انقلاب" تک قابل رشک تھی، ملک کے تمام اخبار اُس کی تصاویر اور اُس کے ذکر سے بھرے ہوتے تھے، ہر شخص اُس کے سراپا کو ایک نظر دیکھنا اپنا فرض سمجھتا تھا بین الملی شہرت بھی فوراً نوجوان مصنف کے قدم چومنے لگی۔ جرمنی، بالخصوص، اُس پر لٹو ہوگیا۔ ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیانی عرصے میں گورکی کی شاہکار تمثیل (NADNE) برلین کے ایک تھیٹر میں متواتر پانچ سو راتوں تک سٹیج ہوتی رہی۔

پیٹرزبرگ میں گورکی کا بیشتر وقت "مارکسیوں" کی صحبت میں گذرا، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود مارکسی بن گیا اور اُس نے اپنی دو تصانیف Three of Them اور (FOMA) مارکسی مجلہ (Zhizn) کے سپرد کردیں۔ یہ دونوں کتابیں اس رسالے میں بالاقساط شائع ہوئیں۔ گورکی ایک نظم (Song of Petiel) کی اشاعت کی وجہ سے یہ رسالہ حکومت نے ضبط کرلیا (Petrel) کے معنے

علہ مشہور یہودی فلسفہ دان کارل مارکس کے پیرو۔

"طوفان کا پیغام لانے والا" ہیں۔ یہ گیت آنے والے انقلاب کی ایک بے نقاب تمثیل تھی۔

میکسم گورکی کا اصلی نام الیکسی میکسی مووچ پیشکوف ہے۔ اس کا باپ میکسم پیشکوف ایک معمولی خوردہ فروش تھا، جو بعد ازاں اپنی علو ہمتی اور محنت کشی سے استراخان میں جہازوں کا ایجنٹ بن گیا۔ اس نے نزہنی نووگورود کے ایک رنگ ساز وسیلی کیشرن کی لڑکی سے شادی کی جس کے بطن سے میکسم گورکی ۱۴ مارچ ۱۸۶۹ء کو پیدا ہوا، پیدائش کے فوراً بعد باپ اپنے بچے کو استراخان لے گیا۔ یہاں گورکی نے اپنی زندگی کی ابھی پانچ بہاریں دیکھی تھیں، کہ باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اب گورکی کی ماں اسے استراخان یعنی اس کے دادا کے گھر لے آئی۔

گورکی نے اپنے بچپن کے زمانے کی داستان اپنی ایک تصنیف میں بیان کیا ہے۔ اس میں اس نے اپنے جابر دادا اور رحمدل دادی کے کرداروں کی نہایت فنکاری سے تصویرکشی کی ہے، جس کے نقوش قاری کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتے۔

جوں جوں گورکی نے ہوش سنبھالا، اس کے گردوپیش کا افلاس زدہ ماحول تاریک تر ہوتا گیا۔ اس کی ماں نے جیسا کہ گورکی لکھتا ہے "ایک نیم عاقل شخص سے شادی کر لی" — اس شخص کے متعلق گورکی کی کوئی اچھی رائے نہیں ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد اس کی والدہ بھی اسے داغ مفارقت دے گئی اور اس کے دادا

نے اُسے خود کمانے کے لئے گھر سے رخصت کر دیا۔ قریباً دس سال تک نوجوان گورکی روس کی سرحدوں پر فکرِ معاش میں مارا مارا پھرتا رہا۔ کشمکش کے اس زمانے میں اُسے ذلیل سے ذلیل مشقت سے آشنا ہونا پڑا۔

لڑکپن میں اُس نے ایک کفش دوز کی شاگردی اختیار کی۔ یہ چھوڑ کر وہ ایک عرصے تک دریائے رانگا کی ایک دخانی کشتی میں کھانا کھلانے پر نوکر رہا، جہاں ایک بوڑھے سپاہی نے اُسے چند ابتدائی کتابیں پڑھائیں اور اس طرح اُس کی ادبی زندگی کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اُن کتابوں میں سے جو گورکی نے تختۂ جہاز پر اس بوڑھے سپاہی سے پڑھیں ایک کتاب "[illegible]" تھی۔ ایک عرصے تک اُس کے زیرِ مطالعہ صرف ایسی کتب رہیں جن کے اوراق کشت و خون اور شجاعانہ رومانی داستانوں سے لبریز ہوا کرتے تھے۔ اس مطالعے کا اثر اُس کی اوائلی تحریروں میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔

پندرہ برس کی عمر میں گورکی نے قازان کے ایک سکول میں داخل ہونے کی کوشش کی، مگر جیسا کہ وہ خود کہتا ہے "ان دنوں مفت تعلیم دینے کا رواج نہیں تھا، وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بلکہ اُسے بھوکے مرنے سے بچاؤ حاصل کرنے کے لئے بسکٹوں کے ایک کارخانے میں کام کرنا پڑا۔ یہ وہی کارخانہ ہے، جس کی تصویر اُس نے اپنے شاہکار افسانے "چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" میں بڑی وضاحت سے کھینچی ہے۔

قازان میں ایسے طلبہ سے ملنے کا اتفاق ہوا جنہوں نے اُس کے دماغ میں انقلابی خیالوں کی تخم ریزی کی۔ قازان کو خیر باد کہنے کے بعد وہ جنوب مشرقی اور مشرقی روس کے میدانوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ اس زمانے میں اُسنے ہر نوعیت کی مشقت سے اپنا پیٹ پالا۔ اکثر اوقات اُسے کئی کئی روز فاقے بھی کھینچنے پڑے۔

۱۸۹۰ء میں وہ نزنہی زنگروڈ بھرتی ہونے کے لئے آیا۔ خرابی صحت کی بنا پر اُسے یہ ملازمت تو نہ مل سکی مگر وہ نزنہی کے ایک وکیل مسٹر ایم۔ اے لینن کے یہاں منشی کی حیثیت میں نوکر ہو گیا (گورکی اپنے محسن کا بہت احترام کرتا ہے چنانچہ اُس کے افسانوں کا ایک مجموعہ مسٹر ایم۔ اے لینن سے معنون ہے) اس وکیل نے اُس کی تعلیم کیطرف توجہ دی۔ تھوڑے عرصے کے بعد ہی گورکی کے ذہنی تلاطم نے اُسے مجبور کر دیا کہ زندگی کے نئے پہلوؤں کی طرف توجہ کرے

میکسم گورکی اب روس کی جمہوریت پسند دُنیا کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور و معروف شخصیت تھی، مالی نقطۂ نظر سے بھی اُسے بہت اہمیت حاصل تھی، اُس کی تصانیف کا پیدا کردہ روپے کا بیشتر حصہ انقلاب کی تحریک میں صرف ہوتا رہا۔ خرچ کا یہ سلسلہ ۱۹۱۷ء کے اختتام تک جاری رہا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گورکی اپنی کتابوں کی مقبولیت اور حیرت فزا فروخت کے باوجود اپنی محنت کے ثمر سے پوری طرح فائدہ نہ اُٹھا سکا۔

۱۹۰۰ء میں روس کی فضا سخت مضطرب تھی۔ اسوقت گرفتاریوں اور سزاؤں کا بازار گرم تھا۔ چنانچہ گورکی گرفتار ہوا اور اسے سینٹ پیٹرزبرگ سے نکال کر نزہنی میں نظر بند کر دیا گیا۔

۱۹۰۲ء میں گورکی "امپیریل ایکیڈیمی آف سائنس" کا اعزازی رکن منتخب کیا گیا۔ مگر چونکہ نئے اکادمی پولیس کے زیر نگیں تھی، اس لئے حکومت نے فوراً ہی اس انتخاب کو رد کر دیا۔ اسپر کارلنکو اور چیخوف سخت مشتعل ہوئے اور احتجاج کے طور پر اکادمی سے علیحدہ ہو گئے۔

پہلے انقلاب میں گورکی نے بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ جنوری ۱۹۰۵ء میں اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری نے تمام دنیا میں گورکی کے چاہنے والے پیدا کر دیئے۔ رہائی کے بعد گورکی نے ایک روزانہ اخبار جاری کیا جس کے کالم بالشویک تحریک کی نشو و ارتقا کے لئے مخصوص تھے۔ اس روزنامے میں گورکی نے بیسویں صدی کے تمام روسی ادبا کو بیہودہ قرار دیتے ہوئے مقالوں کا ایک تانتا باندھ دیا۔ ان انشا پردازوں میں جو اس کے نزدیک فضول تھے، طالسطائی اور دوستووسکی بھی شامل تھے۔ وہ انہیں (Petty bourgeois) کا نام دیتا ہے۔

اس زمانے میں روس کے غیر ملکی قرضوں کی بہت مخالفت ہو رہی تھی۔ گورکی نے اس تحریک میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا اور دسمبر میں ماسکو کی

مسلح بغاوت کی ہر ممکن طریق سے مدد کی ۱۹۰۶ء میں روس چھوڑ کر وہ امریکہ چلا گیا۔ فن لینڈ اور سکینڈے نیویا کا سفر ایک پرشکوہ اور ظفر مند جلوس کی صورت میں تھا۔ امریکہ میں اُسکا استقبال بڑے شاندار طریقے پر کیا گیا۔ مگر فوراً ہی وہاں کے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ گورکی جس عورت کے ساتھ رہتا ہے۔ اور اُسے اپنی منکوحہ بتاتا ہے فی الحقیقت اُس کی بیوی نہیں، اس واقعہ نے امریکنوں کے دلوں میں اُس کے خلاف نفرت پیدا کر دی۔ اُسے ہوٹل چھوڑ دینے کے لئے کہا گیا۔ اور ایک دعوت میں جو اُس کے اعزاز میں دی جا رہی تھی مارک ٹوین امریکہ کا مشہور مزاح نگار) نے صدارت سے انکار کر دیا قدرتی طور پر گورکی اظہارت کے اس غیر متوقع جذبے سے سخت رنجیدہ ہوا۔ جو ایک رُوسی کے لئے بالکل ناقابلِ فہم تھا۔ اس ذہنی تکدّر نے اُسے چند امریکی افسانے سپردِ قلم کرنے پر مجبور کیا جو ۱۹۰۷ء میں The city of yellow Devils کے معنی خیز عنوان سے شائع ہوتے رہے۔

یورپ واپس آنے پر وہ کیپری میں سکونت پذیر ہوا۔ یہاں کے لوگوں میں اُسے بہت ہر دلعزیزی نصیب ہوئی۔

(Measina) کی ہولناک آفت کے بعد ریلیف کے کاموں میں حصّہ لینے کی وجہ سے اطالیہ، گورکی کا گرویدہ ہو گیا۔ اسی عرصے میں رُوس کے ادبی حلقوں میں اُس کی شہرت کم ہونے لگی (NO DUA) کے بعد تصانیف کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو ہونا چاہیئے تھے۔ گو ادبی حلقوں میں اُسکی شہرت

کو اسطرح زوال پہنچا، مگر دوسری طرف اُس کے افکار رُوسی مزدوروں کے دل و دماغ میں گھر کرنے لگے۔ رُوسی مزدوروں کی وُہ ذہنیت جو ہمیں ۱۹۱۷ء تک نظر آتی ہے۔ دراصل گورکی کی تصانیف کی رہینِ منت ہے۔

رُوس واپس آنے پر اُس نے ایک ماہانہ رسالہ ( ) کے نام سے شائع کرنا شروع کیا مگر یہ مقبول نہ ہوسکا۔

جنگِ عظیم چھڑنے پر گورکی نے بین الملی پوزیشن اختیار کر لی اور ۱۹۱۷ء میں اپنے قدیم دوستوں یعنی بالشویکوں کی مدد کی مگر یہ امداد غیر مشروط نہ تھی، گو اسکا اثر لینن اور اس کی پالیسی کے حق میں تھا مگر اُس نے اس مرتبہ خود کو پارٹی کا طرفدار ظاہر نہ کیا۔ بلکہ غیر جانبدار اور امن پسند بنے رہنے کی کوشش کی، اُسکی یہ تاقل برتری اور مشفق نگہ حرف گیر علیحدگی کافی موثر ثابت ہوئی۔

بالشویکوں نے اس رویّے پر ضرورت سے زیادہ سرگرمی کا اظہار نہ کیا، لیکن ایک طرف گورکی کے بالشویک پارٹی کے سرکردہ لیڈروں سے ذاتی تعلقات اور دوسری طرف اُس کی بیرونی شہرت کی فراوانی نے اُسے ایک اعلیٰ حیثیت بخشی ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک قطعی طور پر سوویٹ رُوس میں پبلک کی آواز قوت صرف گورکی ہی تھا۔

اگرچہ گورکی کے غیر جانبدار رویّے کو قابلِ تحسین قرار نہ دیا جائے۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اُس ہولناک زمانے میں اُس کی سرگرمیاں قابلِ صد آفرین ہیں اگر وہ

اس سے قبل امن پسند اور تہذیب و تمدن کا حامی بننے کا جھوٹا دعویٰ کر رہا تھا۔ تو اس نے اس مرتبہ فی الواقع اپنے آپ کو ایسا ثابت کر دکھایا۔ 'روسی تمدن' درحقیقت گورکی کی اخلاص کیشانہ سرگرمیوں کا شرمندۂ احسان ہے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۱ء کے دوران میں وہ سرکوشش جو روسی انشاء پردازوں اور دیگر صحافیوں کو گرسنگی اور فاقہ کشی سے بچانے کے لیے عمل میں لائی گئی، صرف گورکی کی توجہ کا نتیجہ تھی۔ اس نے اس غرض کے لئے اپنے سیاسی دوستوں کی مدد سے ایک ایسا مرکزی ادارہ قائم کیا۔ جہاں روسی ادبا سے غیر ملکی زبانوں کے تراجم کرائے جاتے تھے اور اسطرح انہیں پیٹ بھر کر کھانا نصیب ہو جاتا تھا۔

۱۹۲۲ء میں اس نے روسی کسانوں پر ایک زبردست مقالہ لکھا جس میں اس نے اس جماعت کی غیر معمولی ترش لفظوں میں ملامت کرتے ہوئے اُسے ہر برائی کا مسکن ٹھیرایا ہے۔ گورکی اس جماعت کے افراد کو اس لئے مورد الزام بناتا ہے۔ کہ انہوں نے قومی تہذیب کی تاسیس میں کوئی حصّہ نہ لیا۔

اس سال کے آخر میں گورکی نے روس کو خیرباد کہہ کر جرمنی میں سکونت اختیار کر لی۔ اُس کی صحت جو پہلے ہی سے بہت خراب تھی اب بالکل گر چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود اُس نے قلم اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے۔ وہ ایک رسالے (Besada) کی ادارت کے فرائض بھی انجام دے رہا ہے۔ جس کے ذریعے وہ سائنس کی جدید ترقی کو اپنے ملک سے روشناس کرانا چاہتا ہے۔ گذشتہ چند

ص؎ یہ مقالہ اس وقت لکھا گیا جب گورکی زندہ تھا۔

سالوں سے گورکی کے پیش نظر صرف یہی چیز ہے۔ اس لیے کہ وہ دیکھتا ہے کہ ابتدائی علم کی نشر و اشاعت ہی اُس کے ملک کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

اخباری اور محض سیاسی تحریروں کو شامل نہ کرتے ہوئے۔ ہم گورکی کی باقی تصانیف تین حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) وہ مختصر افسانے جو ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۹ء کے درمیانی عرصے میں سپردِ قلم ہوئے اور جن کی وجہ سے گورکی کو مقبولیت حاصل ہوئی۔

(۲) اُس کے معاشرتی ناول اور ڈرامے جو ۱۸۹۹ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیانی برسوں میں لکھے گئے۔

(۳) ۱۹۱۳ء سے لیکر اسوقت تک کی تمام تحریریں جو زیادہ تر سوانح حیات اور تذکروں کی شکل میں ہیں۔

گورکی کی تصانیف کا پہلا اور آخری دور درمیانی زمانے کی تحریروں کی نسبت زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ ان تحریروں میں ہم اُس کی تخلیقی قوّت ایک حد تک ضعیف دیکھتے ہیں۔

گورکی ابتدائی تصانیف کی "حقیقت نگاری" میں رومانیت بدرجہ اُتم موجود ہے۔ رومانیت کا یہی عنصر اُس کی مقبولیت کا موجب ہوا۔ اس کے برعکس غیر ممالک میں اُس شہرت کا باعث اُس کی حقیقت نگاری تھی۔ اُس کے پہلے افسانوں کی تازگی روسی قاری کی نظر میں صرف اُس کی جواں و بیباک نگاری

تھی، لیکن غیر ملکی قاری اُس خام اور ستمکار اندازِ بیان میں تازگی محسوس کرتا تھا جس کے ذریعے اُس نے اپنی 'دوزخ نما' دُنیا کی تصویر کشی کی ہے۔

ان سطور سے ہمیں اوائلی گورکی کے متعلق رُوسی اور غیر ملکی قاری کی پسندیدگی کے مقابل کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، اس تضاد کی وجہ فی الحقیقت "عقبی مناظر" کا تخالف ہے۔ روسیوں نے اُس کے افکار کو چیخوف اور ۱۸۸۰ء کے دیگر انشا پردازوں کے گرائے ہوئے مغموم و یاس آفریں پردے پر دیکھا اور غیر ملکیوں نے عہدِ وکٹوریہ کی مروج پرسکون حقیقت نگاری کے پردہ پر۔

گورکی کے شروع شروع کے افسانے بالکل رومانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان افسانوں میں The old women Izergil اور Makar chudra کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ان افسانوں کی رُومانیت نمائشی اور تھیٹریکل ہے۔ لیکن اُسی رومانیت نے چیخوف سے اُچاٹ رُوسی قاری کی نظر میں گورکی کا تیہ پیدا کیا۔ اُسکی یہ رومانیت ایک ایسے فلسفے کی شکل اختیار کر گئی، جسے اس نے بڑے خام اور سادہ انداز میں اپنے ایک افسانے، The siskin who lied of the truth-loving wood pecker میں بیان کیا ہے۔ اس کہانی کا مفاد یہ ہے کہ وہ دروغ جو رُوح کو سرفرازی بخشے، بہتر ہے۔ اُس سچائی سے جو ذلت اور پستی میں دھکیلنے والی ہے۔

۱۸۹۵ء میں گورکی نے دفعتہً چوروں اور جنگلی انسانوں کی داستانیں

قلم بند کرنا چھوڑ کر نیا رُخ بدلا۔ اب اُس نے جو روش اختیار کی، حقیقت نگاری کی تشکیل اور رومانی الہام کا اجتماع تھی، اُسکا پہلا افسانہ 'چلکاش' جو بڑے پریس' میں شائع ہوا بہت کامیاب ہے۔ اس داستان کا موضوع چلکاش نامی ایک تیز تیرو اور نڈر خفیہ فروش ہے اور اُس نوجوان طامع لڑکے کا تقابل ہے جسے چلکاش اپنے خطرناک اور مجرمانہ پیشے میں شریک بناتا ہے۔ چلکاش کا کردار قابلِ تعریف صفائی اور بہترین فن کاری سے پیش کیا گیا ہے۔ اس قسم کے دو اور افسانے (Malva) اور (My fellow Travellers) ہیں اول الذکر افسانے میں مالوا عورت کے بھیس میں دوسرا چلکاش ہے۔ موخر الذکر داستان کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے غیر فانی حیثیت رکھتی ہے۔ مائی فیلو ٹریولرز میں پرنس شنارکو (جس کے ہمراہ داستان گو، اوڈیسا سے طفلس تک پیدل سفر کرتا ہے) کردار فی الحقیقت گورکی کی ایک نادر تخلیق ہے۔ —— شنارکو کے کردار میں" شائیتت" شمہ بھر موجود نہیں گو یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ مصنف کی صناعانہ ہمدردی، صرف اُسی کے حق میں ہے۔

ان خصوصیتوں میں سے جو گورکی کی شہرت کا باعث ہوئیں۔ ایک اُس کے نیچر کو بیان کرنے کا خاص انداز ہے۔ ہم یہاں مثال کے طور پر اُسکے افسانوں میں سے چند جملے پیش کرتے ہیں۔

"گودی کے گرد و غبار میں جنوبی نیلگوں آسمان گدلا ہے تاباں سورج سبزی

سنہری ہائل سمندر کو دھندلی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے اُس نے خاکستری نقاب اوڑھ رکھی ہے سورج کا عکس سمندر کی سطح پر چپوؤں کے تھپیڑوں اور فانی کشتیوں اور جہازوں کی نقل و حرکت کی وجہ سے نہیں پڑ رہا۔ جو بندرگاہ پر ہل چلا رہے ہیں، یہاں سمندر کی آزاد موجیں سنگین دیواروں میں قید اور اُن بھاری وزنوں کے نیچے دبی ہوئیں، جو اُن کے سینے کو کچلتے ہیں۔ جھاگ بن بن کر اپنی چھاتی کوٹتی ہیں ـــــ شکایت کرتی ہیں ـــــ از
'چیلکاش'

"مائی فیلو ٹریولر" کا یہ ٹکڑہ بھی اس قسم کی تحریر کا نمونہ پیش کرتا ہے ـــ
"ہم نے الاؤ روشن کیا اور اس کے قریب لیٹ گئے۔ رات بہت شاندار تھی، گہرے سبز سمندر کی لہریں نیچے، چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ہمارے اوپر نیلگوں آسمان کی پُرشکوہ خاموشی چھائی ہوئی تھی، اور گرد و پیش عطر بیز درخت اور جھاڑیاں بڑی آہستگی سے جھوم رہی تھیں، چاند بلند ہو رہا تھا جس کے ساتھ درختوں کے نازک سایوں کا جھرمٹ پتھروں پر رینگ رہا تھا۔ قریب ہی کوئی خوش گلو پرندہ راگ الاپنے میں مصروف تھا۔ اُس کی نقرئی آواز فضا میں جواہروں کے تھپیڑوں کی دھیمی اور دلنواز صدا سے معمور تھی۔ آہستہ آہستہ حل ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ . . . . . آگ تیزی سے جلنے لگی الاؤ کے شعلے سُرخ و زرد پھولوں کا ایک گلدستہ نظر آتے تھے۔ کانپتے ہوئے

سائے ہمارے آس پاس رقص کر رہے تھے،

گورکی کے بیشتر افسانوں میں اس قسم کی تفصیلات عام ہیں۔ اُس کی تحریروں میں لہروں اور نیلگوں آسمان کی پُراسرار اور پُرشکوہ خاموشی کا ضرور ذکر ہوتا ہے۔ چیخوف گورکی کی عظمت و ذکاوت کا قائل تھا۔ مگر اُس کی نظروں میں یہ اعادہ غیر صناعانہ تھا۔ چنانچہ وہ گورکی کو ایک خط میں لکھتا ہے۔

"۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے میرا صحیح مطلب نہیں سمجھا ہے۔ میں نے اپنے خط میں خامکاری کے متعلق ذکر کیا تھا۔ بلکہ میرے پیش نظر غیر روسی الفاظ کا نامناسب استعمال تھا، دوسرے ادیبوں کی تحریروں میں اس قسم کے غیر مانوس الفاظ نظر انداز ہو جاتے ہیں مگر چونکہ آپکے ادبی پارے موسیقی اور ہم آہنگی کا اجتماع ہوتے ہیں، اس لئے اُن میں آپکے قلم کی معمولی سے معمولی خام جنبش بھی پوری آواز میں چلا اُٹھتی ہے۔

" آپ کے افسانے اس امر کے شاہد ہیں کہ آپ مکمل آرٹسٹ ہیں اور حقیقی معنوں میں ایک متمدن صناع۔ کسی حد تک 'خامکاری' آپ کی خصوصیت ہے، آپ عاقل ہیں۔ آپ کے احساسات نکتہ رس اور لطیف ہیں۔ آپکی ذکاوتِ طبع "میدانوں میں" اور "تختۂ جہاز پر" میں نمایاں طور پر جلوہ فگن ہے یہ دونوں افسانے فی الحقیقت صنعت کے بلند مرتبت شاہکار ہیں، انکے مطالعے سے یہ چیز روشن ہوتی ہے۔ کہ آپ نے کسی اچھی تعلیم گاہ میں دن

گذارے ہیں میرا خیال ہے کہ میں یہ کہتے وقت غلطی نہیں کر رہا ہوں، اگر آپ کی تصانیف میں کوئی نقص ہے تو فقدانِ ضبط اور حُسنِ لطافت کی کمی ہے

کسی خاص مقصد کے لئے کم سے کم نقوش کا استعمال — یہ ہے "حُسنِ لطافت" آپ کا اسراف ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے۔ آپ کی نیچر سے متعلقہ تفصیلات صناعانہ ہیں۔ آپ فی الواقع لینڈ سکیپ پینٹر ہیں۔ لیکن ان تفصیلات میں بے جان اشیا کو جاندار ظاہر کرنے والے استعارات کی فراوانی — مثال کے طور پر، سمندر سانس لیتا ہے، آسمان دیکھتا ہے جنگل دلنوازی کرتا ہے، نیچر سرگوشیاں کرتی ہے۔ روتی ہے، بولتی ہے اور علیٰ ہذا القیاس — اس قسم کے فقرے تفصیلات میں یک آہنگی اور تکرار پیدا کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات وہ انہیں لطافت سے بھی عاری کر دیتے ہیں۔ نیچر کے بیانات میں رنگ اور اظہار صرف سادگی، یعنی بارش گرنا شروع ہوئی، تاریکی چھا گئی، سورج غروب ہوا۔ ایسے سادہ فقروں سے پیدا ہوتے ہیں۔"

گورکی، واقعی بقدرِ کفایت، ضبط کام میں نہیں لاتا۔ وہ تھیٹر میں ایک ایسے تماشائی کے مرادف ہے، جو اپنے وجد کا اس بے پروا انداز میں مظاہرہ کرتا ہے کہ نہ تو وہ خود سن سکتا ہے اور نہ دوسروں کو سننے دیتا ہے، گو ضبط کا یہ فقدان اُسکی

گفتگوؤں میں مخل ہوتا ہے اور نزاکت، عذوبت، طراوت اور سرگوشیوں کا عام تذکرہ ہوتا ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاتا کہ وہ آرٹسٹ ہے اور نہایت ہوشمند انسان، وہ ہیئت گر ہے یعنی وہ جس چیز کو بیان کرتا ہے، اُسے دیکھتا ہے اور ہاتھوں سے چھوتا ہے ۔ یہ فن کاری ہے۔

"مالوا" کا افتتاحیہ جُملہ جو صرف دو لفظوں (More smeyalls) یعنی "سمندر ہنس رہا تھا" پر مشتمل ہے۔ گورکی کے طرزِ بیان کی خاص مثال ہے۔

۱۸۹۸ء میں گورکی کی "حقیقت نگاری" اُس کی "رومانیت" پر غالب آگئی۔ "جو کبھی انسان تھے" اسپر شاہد ہے۔

اس افسانے اور ہر اُس افسانے میں جو گورکی نے ۱۸۹۷ء کے بعد قلمبند کیا۔ ایک ایسی خصوصیت نمایاں طور پر ظاہر ہے، جو اس کی ادبی شہرت کے زوال کا باعث ہُوا۔ یہ خصوصیّت "فلسفیانہ گفتگوؤں سے حد سے زیادہ بڑھا ہُوا پیار ہے، جب تک اُس نے اس عنصر سے پرہیز کیا، وُہ اپنی تعمیری قوّت کا ثبوت دیتا رہا۔ جو دیگر روسی افسانہ نگاروں میں بہت کم ملتی ہے ۔ مگر گورکی کا "چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" ان تمام عیوب کو بھلا دیتا ہے۔

اس افسانے کا افتتاحی منظر بسکٹ بنانے کا ایک تنگ و تار کارخانہ ہے۔ جہاں چھبیس مزدور چودہ گھنٹے لگاتار مشقت کرتے ہیں۔ گورکی اس افسانے کو اپنے مخصوص انداز میں اسطرح شروع کرتا ہے

"ہم تعداد میں چھبیس تھے، — چھبیس متحرک مشینیں ایک متحرک کوٹھری میں مقید، جہاں ہم صبح سے لیکر شام تک بسکٹوں کے لئے میدہ تیار کرتے ہماری زنداں نما کوٹھری کی کھڑکیاں، جن کا نصف حصّہ آہنی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور شیشے گرد و غبار سے اٹے ہوئے تھے۔ اینٹوں اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کیطرف کھلتی تھیں، اس لئے سورج کی شعاعیں ہم تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔

ہمارے آقا نے کھڑکیوں کا نصف حصّہ اس لئے بند کرا دیا تھا کہ ہمارے ہاتھ اُس کی روٹی سے لقمہ بھی غریبوں کے دینے کے لئے باہر نہ نکل سکیں، یا ہم اُن بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں جو کام کی قلت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔

اس سنگین زنداں کی چھت تلے جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑی کے جالے سے اٹی ہوئی تھی، ہم نہایت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُس چار دیواری میں جو کیچڑ اور میدے کے ضمیر سے بھری ہوئی تھی، ہماری زندگی — غم و فکر کی زندگی تھی۔"

گورکی اپنی بیشتر تصانیف میں مزدوروں اور غربت زدہ کسانوں کو انسان کی صورت میں پیش نہیں کرتا۔ یہ چیز یورپی ذہن کے لئے جو خوشگوار ماحول کا عادی ہے نئی اور عجیب حیثیت رکھتی ہو مگر ہندستان جو روس کے اُس زمانے کی فضا سے

صدگونہ مماثلت رکھتا ہے۔ اُن کرداروں کو "جو کبھی انسان تھے" بخوبی سمجھتا ہے۔

جب گورکی "چھبیس متحرک مشینیں" لکھتا ہے، تو ہمیں تعجب نہیں ہوتا۔ ہم ذرا سمجھ لیتے ہیں کہ یہ لفظ ناکامی، حزن و ملال اور تاریک زندگی کا مطالعہ پیش کر رہے ہیں۔

گورکی انسان کو اُس شکل میں پیش نظر رکھتا ہے، جیسا وہ ہے۔ اس کے کردار بھوک کو "معاشی وبا" نہیں کہتے وہ اسے صرف بھوک کہتے ہیں۔ وہ امرا کو "سرمایہ دارانہ عناصر کا اجتماع" نہیں کہیں گے۔ وہ انہیں صرف امراء کا نام دیں گے۔ گورکی کی یہ سادہ بیانی اور صاف گوئی اُس کی تمام تصانیف میں موجود ہے۔ "چھبیس متحرک مشینیں" پڑھتے وقت اُن مزدوروں کی لاتنا ہی محنت و مشقت اور بے بسی کی ایک صاف تصویر کھنچ جاتی ہے۔

اس افسانے میں چھبیس زشت رُو غلیظ مزدوروں کی ایک داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ سب ایک حسین دوشیزہ کی محبت میں گرفتار ہیں، جو ہر روز اُن سے بسکٹ لینے کے لیے آتی ہے۔ اس لڑکی کا معصوم حسن ہی ایک ایسی شعاع ہے، جس سے اُن کی تاریک زندگی آشنا ہے۔

ان لوگوں کو جو سب کے سب غلیظ اور ان میں سے اکثر مریض ہیں، صرف ایک چیز منسلک کئے ہوتی ہے ۔۔ ٹینیا سے اُن کی جذباتی محبت گورکی بڑی وضاحت سے

ان کی اس اجتماعی محبت کی تشریح کرتا ہے

"—— گو زندان نے ہم سب کو وحشی درندوں سے بدتر بنا دیا تھا۔ مگر پھر بھی پھر بھی ہم انسان تھے۔ اور بنی نوع انسان کی طرح ہم بھی کسی کی پرستش کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ہمارے لئے اُس کی ذات سے بڑھکر دُنیا میں اور کوئی شے نہ تھی۔ اسلئے کہ بیسیوں انسانوں میں سے جو اس عمارت میں رہتے ایک صرف وُہی تھی جو ہماری پروا کیا کرتی تھی ——

ہر روز اُس کے لئے بسکٹ مُہیا کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے تھے —— یہ ایک نذرانہ ہوتا، جو ہم ہر روز اپنے دیوتا کی قربان گاہ پر پیش کیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ رسم ایک مُقدس فرض ہوگئی جس کے ساتھ ہمارا اور اُس کا رشتہ بھی باہم مضبوط ہوگیا۔ ہم ٹینیا کو نصیحتیں بھی کیا کرتے۔ یہی کہ وہ اس سردی میں گرم کپڑے استعمال کیا کرے اور سیڑھیوں پر سے احتیاط کے ساتھ گذرا کرے ——"

مندرجہ بالا سطور سے مزدوروں کا بچپن نمایاں طور پر ظاہر ہے، اس بچپن سے گورکی کو یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ چھبیس غیر تربیت یافتہ مزدور کس غیر معمولی اخلاص اور سادگی سے ٹینیا کی محبت میں گرفتار تھے۔ دراصل ان مزدوروں کو اپنی تاریک زندگی میں صرف ایک ہی شعاع نظر آئی جس کا دامن اُنہوں نے پکڑ لیا۔ گو یہ لوگ، غلیظ، وحشی، جاہل اور غیر تربیت یافتہ ہیں، لیکن اُس کے باوصف اُن کے

کھردرے قلوب پر ٹینیا کا وجود پورا اثر کرتا ہے، وہ اُسے حقیقی حسن کا سرچشمہ تصوّر کرتے ہیں۔

یہ جُدا بات ہے کہ یہ لوگ اپنی غربت اور پُرازمصائب زندگی کے خود آپ ذمہ دار ہوں مگر اُن کا تصوّر نہیں ہے کہ وہ مذہب یا آئیڈیل نہیں رکھتے اور وہ اُمیدوار خواہش زندگی سے ناآشنا ہیں۔ "روسی معاشرہ میں آزاد افکار کی نااستواری کا وجُود" جیسا کہ گورکی اپنی ایک تصنیف میں لکھتا ہے۔ "مثالیت سے غفلت برتنے کا نتیجہ ہے۔"

ٹینیا چھبیس مزدوروں کی نظر میں ایک فرشتہ ہوتی ہے اس کی پاکیزگی اور نیکی نہ صرف اُن کی گفتگوؤں کا موضوع ہوتی ہے۔ بلکہ وہ ان مزدوروں کی زندگی کو نئے معانی بخشتی ہے۔

بڑے ڈرامائی اور بے رحم انداز میں گورکی اپنے پیشِ نظر مقصد کو رفتہ رفتہ آشکار کرتا ہے چھبیس مزدور اپنی دیوی کی عصمت کا امتحان لیتے ہیں ایک سپاہی جو اُس کارخانے میں اُن کی نسبت اچھے کام پر نوکر ہوتا ہے۔ اُن سے دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ٹینیا کو ہتھے چڑھا لے گا۔ مزدور سپاہی سے شرط تو لگا بیٹھتے ہیں مگر وہ ایک بیقراری مول لے لیتے ہیں۔

"اب ہمیں معلوم ہُوا کہ ہم شیطان سے بازی لگا بیٹھے ہیں۔ جب ہم نے کیک بنانے والے نانبائی سے یہ خبر سُنی کہ سپاہی نے ٹینیا کا پیچھا کرنا

شروع کر دیا ہے، تو ہمیں سخت رنج پہونچا اور ہم اس رنج کو مٹانے کے لئے اسقدر محو تھے کہ ہمیں یہ معلوم تک نہ ہوا کہ آپ نے ہماری بے چینی اور اضطراب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے قرض میں پچیس کا اضافہ کر دیا ہے۔"

گو وہ حد درجہ مضطرب تھے اور اس بات پر نادم تھے کہ انہوں نے کیوں خواہ مخواہ بیٹیا کی عصمت کا انکار کر دیا، مگر بایں ہمہ وہ اس روز کے منتظر تھے جب انہیں یہ معلوم ہو جانے والا تھا کہ وہ بے تمیز جس پر وہ سب اپنے دل رکھے ہوئے تھے کتنا صاف اور بے لوث ہے۔

بد قسمتی سے بیٹیا با عصمت ثابت نہیں ہوتی۔ اور وہ سپاہی کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔

یہ داستان خوشگوار نہیں ہے لیکن گورکی کے قلم نے اسے اس غیر جانبدارانہ تفصیل سے بیان کیا ہے کہ یہ ہولناک حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ یہ افسانہ شعریت کی اس قدر زوردار رو سے لبریز ہے۔ اسمیں آزادی اور حسن کا اتنا معتدل ایمان ویقین ہے اس کے علاوہ یہ داستان اسقدر صحت فن کاری سے بیان کی گئی ہے کہ ہم اسے گورکی کا شاہکار تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکتے یہ افسانہ اسے بلا شک وشبہ روس کے بلند مرتبت کلاسکس کی صف اولیں میں جگہ دلواتا ہے۔

"اس کا محبوب" "میں بھی" "چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ" کی روح کار فرما

ہے۔ یہ ادب کا ایک درخشاں ٹکڑہ ہے، جو شعریت، موضوع کی رفعت تخیل اور صفتِ صحیحہ کے نقطۂ نظر سے اپنی قسم کا واحد اضافہ ہے۔ اسمیں بدشکل لڑکی کے خیالی محبوب کی تخلیق واقعتاً نادر اور شاندار ہے۔

گورکی اپنے افسانوں میں ارادۃً سوسائٹی کے پائیں طبقے کو زیرِ قلم رکھتا ہے اُس کے کردار بالعموم اپنے مقاصد میں ناکامیاب رہتے ہیں۔ اس کی تمام تر وجہ یہ ہے کہ اُس زمانے میں جب وہ ایک آوارہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ اُسے اسی قسم کے واقعات سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

گورکی کے افسانوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ چیز ہرگز نہ فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ گورکی کی پرورش آغوشِ غربت میں ہوئی اور یہ کہ اُسے اپنا پیٹ پالنے کی خاطر ایک طویل عرصے تک ذلیل سے ذلیل مشقت کرنا پڑی۔ اب اُس شخص کے بربط فکر سے جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ایک تاریک فضا اور غیر تربیت یافتہ درشت مزدوروں میں بسر کیا اور کس قسم کے نغمے بلند ہو سکتے ہیں؟ گورکی ہمیں وہی کچھ پیش کرتا ہے، جو اُس کے حساس دل نے محسوس کیا اور جو اس کی چشمِ فکر نے مشاہدہ کیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اُس کا اندازِ بیان بہت بے باک ہے۔

جس طرح بائرن کا ترنم آتشیں اور آزاد ہے۔ ٹھیک اُسی طرح گورکی کی آواز بلند، دیوانہ وار اور بے لگام ہوتی ہے۔ جب وہ برہنہ پا و گرسنہ شکم لوگوں کا گیت الاپتا ہے۔ جو اپنی کاہلی پر نازاں ہیں، جو مفلس تو ہیں۔ مگر نڈر، جو اپنی

پُرازمصائب زندگی سے خوش ہیں اور مسرت کے وقت مغموم۔

گورکی کی صدا، چیخوف کی شائستہ، نرم ونازک، اور تھمی ہوئی آواز نہیں، نہ وہ معلمِ اخلاق طالسطائی کی کمزور زاہدانہ صدا ہے۔ وہ چنگھاڑتے ہوئے شیر کی ایک گرج ہے۔ چمکتی ہوئی بجلی کی ایک کڑک، ابتدائی قوت میں یہ آواز کسی ایسے حساس انسان کی دل میں اُتر جانے والی چیخ ہے۔ جس نے زندگی کے مصائب آلام سہہ کر دُہی دُنیا کے منہ پر نہایت بے دردی سے تھوک دیئے ہوں۔

وہ دُنیا، جو گورکی اپنے افسانوں میں پیش کرتا ہے، ہماری دیکھی بھالی نہیں اور وہ کردار جو اُس کے افسانوں کے محرک ہیں، ہم اُن سے نا آشنا ہیں، مگر اس کے باوجود ہم اُس سرزمین کے جغرافیائی حالات کے سوا اور کچھ نہیں جانتے، گورکی ہمیں اُن گہرائیوں تک لے جاتا ہے۔ اور روسی زندگی کی ایسی قلمی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے، جن سے عکسی تصاویر عاجز ہیں۔

گورکی کے افسانوں کے کردار عموماً کسان یا مزدور جماعت کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک روسی نقاد ان لوگوں کے متعلق لکھتا ہے:۔

"وہ ایسے ناکارہ انسان ہیں، جو دُنیا کی شاہراہوں پر بھٹک رہے ہوں اُنکے ذہن غلاموں ایسے ذہن ہیں، کسی آقا یا زندگی کے ایسے قانون کی تلاش، جسکی وہ آنکھیں بند کئے اطاعت کرسکیں۔ اُن کا واحد مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ اُن میں تشخص اور کیریکٹر کی استواری کا فقدان ہوتا ہے

اگر ان میں الیا[1] ٹیو نیف ایسی ہوشمندی اور ذہانت اور اپنی کوششوں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تو انہیں نظام خودی کا عنصر بہت کم ہوتا ہے، جو انجام کار انکی زندگی کو مغموم بنا دیتا ہے ان تمام امور کے ہوتے ہوئے اُن کا خالق یعنی گورکی ان میں ایک غیر معمولی اعتقاد رکھتا ہے"

گورکی کے پروردۂ غربت ہیرو، تشخص سے بیگانہ ہوں، وہ زندگی کی شاہراہوں پر بھٹکے ہوئے ناکارہ انسان ہوں مگر اُن میں ایک نمایاں خصوصیت ضرور ہے۔ جسکی مثال روسی ادب میں اور کہیں نہیں ملتی ہے ــ اور دوستو ولیسکی اور تور گنیف کے پیش کردہ کرداروں کی طرح اپنی تیرہ بختی کا رونا نہیں روتے " روسی ہیرو " گورکی اپنے کسی افسانے میں لکھتا ہے" ہمیشہ جاہل اور سادہ لوح ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ کسی ایسی چیز کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کو وہ سمجھ نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ ملول ہوتا ہے۔"

گو ان لوگوں کی زندگی جہالت کا مرقع ہوتی ہے۔ اور انہوں نے غلامی کی فضا میں پرورش پائی ہوتی ہے۔ مگر وہ آزادی کی لذت بھی محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بے خانماں، اور آوارہ زندگی پسند ہے۔ بیشتر اوقات ہمدردی

---

[1] تھری مین کا ہیرو

نے میری رگوں میں خون کو منجمد کیا ہے۔ میں نے فاقے کھینچے ہیں۔
لیکن آزادی عظیم الشان ہے۔"

یہ ہیں وہ الفاظ جو ہم گورکی کے ایک کردار کے منہ سے ادا ہوتے سنتے ہیں شہر کی پرسکون زندگی انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ گورکی کے تقریباً تمام افسانوں میں ہم اُس کے 'خانہ بدوش' اور حریت پسند کردار کسی آئیڈیل کا دامن تھامے دیکھتے ہیں۔ یہ خصوصیت بلاشک وشبہ گورکی کا اپنا عکس ہے۔ اُس کے کردار عموماً سوسائٹی کے مصنوعی نظام سے رہائی حاصل کرکے نیچر کے وسیع کارخانے میں بھاگ آتے ہیں، جہاں اُنہیں سکونِ قلب اور اطمینانِ خاطر نصیب ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہم نیچر کو اُس کے افکار کے دوش بدوش دیکھتے ہیں۔ اور اُسکے کرداروں کی انسانی حسیات میں موجود پاتے ہیں —— انسان اور نیچر میں صوفیانہ قربت، گورکی کی ہر تصنیف میں بدرجۂ اُتم موجود ہے۔

گورکی کے ہیرو بااخلاص اور بے ریا ہوتے ہیں۔ وہ زبان سے وہی کچھ نکالتے ہیں، جو وہ اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ اُن میں تہذیب یافتہ افراد ایسی بناوٹ اور مداہنت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی کو اُسی شکل میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ جیسے وہ اصلاً ہوتی ہے۔

گورکی، جن مفلس، مصیبت زدہ اور بدچلن روسیوں کا ہم سے تعارف کراتا ہے، اُن کی فطرت غربت اور بُری عادتوں کی زنجیروں میں ایسی بُری طرح

جکڑی ہوتی ہے ۔ اُن کے دِلوں کو بُرے اعمال اور ارادوں نے ایسا سیاہ کر رکھا ہے، اُن کے ماحول میں راہِ راست پر چلنے کی ترغیب دلانے والے اثرات، تنے کم اور کمزور ہیں کہ ہمیں اُن کے انسان ہونے میں کیا، زندہ رہنے پر تعجب ہوتا ہے، لیکن انسانیت کی اس عبرت انگیز بربادی میں بھی ایک روشنی کبھی کبھی ظر آجاتی ہے، جس پر اگر اپنی نظر قائم رکھ سکیں تو گورکی کے ویرانے آباد معلوم ہونے لگتے ہیں، اُس کے بیماروں میں صحت کے وُہ آثار، مُردوں میں زندگی کی وُہ علامت ظاہر ہونے لگتی ہیں، جو ہم کو یقین دلاتی ہیں کہ انسانیت کا جوہر کبھی کم نہیں ہو سکتا۔ اُس کے دُشمن اسے چاہے جتنا چھُپائیں وہ ہماری نظروں سے بالکل غائب نہیں ہو سکتا اور جب کبھی وہ نظر آئے گا، تو اس شان سے کہ ہم دوسروں کی نہیں لہ اپنی زندگی بھی اس سے روشن پائیں گے۔ گورکی نے انسانیت کا جو جوہر دریافت کیا ہے، وہ انسانی ہمدردی ہے۔ ایک جذبہ، جو پست حیوانی زندگی کی تاریکی کو اسی طرح ریزہ ریزہ کر دیتا ہے۔ جیسے بجلی، کالی گھٹاؤں کے اندھیرے ــــــ" (اُردو)

اس کتاب کے اوراق میں رُوسی ادب کے اس امام کے سات مشہور افسانوں کے تراجم پیش کیے گئے ہیں۔ گورکی کے باقی ماندہ سات شاہکار اس کتاب کی دوسری جلدیں علیحدہ شائع کیے جائیں گے۔

ہم اپنے محترم دوست شاہد لطیف، مسٹر شہاب الدین شمسی اور بالخصوص

ہندوستان کے نامور ادیب اور فاضل مترجم میاں منصور احمد مرحوم . . . . . .
کے ممنونِ احسان ہیں جنہوں نے ہماری درخواست پر گورکی کے افکار کو اپنے
مخصوص انداز میں اُردو کا لباس پہنایا ۔

سعادت حسن منٹو

میدانوں میں

ہم نے پیری کیپ کو طبیعت کے انتہائی چڑچڑے پن اور بدترین صورت حال کے تحت یعنی جنگلی بھیڑیوں کی طرح گرسنہ اور تمام دنیا سے متنفر خیر باد کہا تھا مکمل بارہ گھنٹے ہم نے اس کوشش میں صرف کر دیئے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ـــــ جائز یا ناجائز طریقے، چوری کے ذریعے یا خود کما کر پیٹ پوجا کا سامان کریں، مگر جب ہمیں اس امر کا پورا یقین ہو گیا۔ کہ ہم اپنے مقصد میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے، تو ہم نے آگے بڑھنے کا قصد کیا ـــــ کدھر؟ ـــ بس ذرا آگے!

یہ فیصلہ اتفاق آراء سے منظور ہو گیا۔ اب ہم زندگی کی اس شاہراہ پہ جس پر ہم ایک مدت سے گامزن تھے، سفر کرنے کو تیار تھے۔ اس امر کا فیصلہ بالکل خاموشی میں ہوا۔ اگر اس فیصلے کو کوئی چیز نمایاں طور پر ظاہر کرنے والی تھی تو وہ ہماری گرسنہ

آنکھوں کی خشمناک چمک تھی۔

ہماری جماعت تین افراد پر مشتمل تھی جن کی شناسائی کو ابھی بہت مدت نہ گذری تھی۔ ہماری دوستی دریائے نیپر کے کنارے خرسون کی ایک سرائے میں واقع ہوئی تھی۔ ہم میں سے ایک ریلوے پولیس میں سپاہی رہا تھا اور اس کے بعد پولستان میں ایک مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا تھا یہ شخص بہت تنومند اور جسیم تھا۔ بال سُرخ ــــ جرمن زبان بول سکتا تھا اور قید خانوں کی اندرونی زندگی سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔

ہماری قسم کے لوگ اپنی زندگی کے گذشتہ حالات پر روشنی ڈالنے کے خیال کو بہت بُرا تصوّر کرتے ہیں، بعض ناگزیر وجوہ کے باعث ہمیشہ خاموشی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمیں اس کا کامل یقین تھا کہ ہمارے ہر ساتھی کے ساتھ ایک نہ ایک تلخ حکایت ضرور وابستہ ہے مگر ہم نے اُن سے اس داستان کے بارے میں کبھی استفسار نہ کیا تھا۔

جب ہمارے ایک ساتھی نے ہمیں یہ بتایا کہ وُہ ماسکو یونیورسٹی کا طالب علم رہ چکا ہے۔ تو ہمیں اُس کی بات کا یقین ہو گیا۔ دراصل ہمارے لئے یہ چیز کوئی اہمیّت نہ رکھتی تھی کہ وہ گذشتہ ایام میں چور رہا تھا یا سپاہی۔ قابلِ ذکر بات تو یہ تھی کہ وہ جب ہم سے ملا، بالکل ہم جیسا تھا۔ اور ہماری طرح پولیس اور دیہات والوں میں مشکوک نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور وُہ جواب میں ان سب کو ایک تعاقب

زدہ بھوکے درندے کی طرح افسردہ اور نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا ـــــ قصّہ کوتاہ ان خیالات اور موجودہ حالات کی رُو سے وہ ہم میں سے ایک تھا۔

مشترکہ مصائب، متضاد طبائع میں اتحاد پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں اور ہمیں اس کا پُورا یقین تھا کہ ہم مصیبت زدہ ہیں۔ تیسرا میں تھا ـــ اپنے شرمیلے پن کی وجہ سے جو بچپن سے میری خصوصیّت رہی ہے، میں اپنی صفات کا تذکرہ بے سُود سمجھتا ہُوں۔ میری عادات وخصائل پر روشنی ڈالنے کے لئے بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ میں اپنے آپ کو اوروں سے ہمیشہ اچھا اور اعلیٰ سمجھتا رہا ہُوں ـــــ اور آج بھی میرا یہی عقیدہ ہے۔

ان حالات کے تحت ہم پیری کوپ کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ رہے تھے ہمارا اوّلیں مقصد کسی گڈریئے کا دروازہ کھٹکھٹا کر روٹی مانگنا تھا۔ یہ لوگ عموماً کسی جہاں گرد سائل کو یا یوں لوٹنے نہیں دیتے۔

میں اور سپاہی پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ طالب علم ہمارے پیچھے آرہا تھا جس کے کاندھوں پر کوئی کپڑا سا لٹک رہا تھا جس نے کبھی جیکٹ کا کام دیا ہوگا۔ ایک بوسیدہ اور چوڑے کنارے والی ٹوپی اُس کے بدوضع سر کی زینت ہو رہی تھی، پتلی ٹانگوں کو ایک پرانی پیوند زدہ پتلون چھپا رہی تھی اور پاؤں میں کسی ٹوٹے ہُوئے بُوٹ کے تلوے جو اُس نے غالباً کسی سڑک پر سے اُٹھائے تھے۔ ایک رسی سے بندھے ہُوئے تھے ـــ اس اختراع کو وہ چپلیوں کے نام سے پکارتا تھا۔ وہ

سڑک پر گرد اُڑاتا اور اپنی چھوٹی چھوٹی سبزی مائل آنکھیں جھپکاتا خاموشی کے ساتھ چلا آ رہا تھا۔

سپاہی ایک سُرخ قمیص پہنے ہُوئے تھا۔ جو بقول اُس کے اُس نے خود اپنی محنت کے پیسوں سے فرسون میں خریدی تھی۔ اس قمیص پر ایک گرم اور نرم سی واسکٹ نظر آ رہی تھی۔ ٹانگوں پر ایک کھُلا پاجامہ لپٹا ہُوا تھا۔ سر پر اُس نے ایک فوجی ٹوپی ترچھے انداز میں پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں بُوٹ وغیرہ کچھ بھی نہیں تھے۔

میں نے کپڑے تو پہنے ہُوئے تھے مگر ننگے پاؤں تھا۔

ہم چلتے رہے ـــــ ہمارے چاروں طرف میدان تھا جس میں گھاس اُگ رہی تھی، ہم موسمِ گرما کے نیلگوں آسمان کے نیچے بڑھتے گئے ـــــ کہیں کہیں کٹی ہُوئی فصل کے نشانات بھی دکھائی دے رہے تھے، جو بعینہٖ سپاہی کے منڈے ہُوئے گالوں کے مانند تھے۔

وہ بھدّی اور کن سُری آواز میں ایک مذہبی گیت گانے میں مصروف تھا۔ دورانِ ملازمت میں وہ کسی گرجے میں لوکر بھی رہ چکا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر اُسے بے شمار مذہبی گیت زبانی یاد تھے۔ اور ہم سے دورانِ گفتگو میں اکثر اس قسم کی معلومات کا بے جا تذکرہ بھی کیا کرتا تھا۔

اب ہمارے سامنے افق پر دھندلی سی لکیریں نمودار ہو رہی تھیں جن کا رنگ

بنفشی سے ہلکا زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔
"یہ کریمیا کی پہاڑیاں ہیں" طالب علم نے اپنی پھٹی آواز میں کہا "پہاڑیاں معلوم ہوتی ہیں"۔
سپاہی نے طنزیہ لہجے میں اُس سے کہا "بہت تیز نظر ہے تمہاری، یہ تو بادل ہیں محض بادل! اور بادل بھی کیسے، جیسے انناس کا مُربّہ دودھ میں بھیگ رہا ہے!"
"آہ، کاش یہ واقعی مربّہ ہوتے!! اس تشبیہہ نے میری بھوک پر تازیانے کا کام کیا"۔
"خدا کی قسم!" سپاہی نے جھلّا کر کہا "کاش ہمیں کوئی انسان مل جائے! —— مگر یہاں تو کسی کا نام و نشان تک بھی نہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں بھی موسم سرما کے ریچھ کی طرح اپنے پنجے چوس کر گذارہ کرنا ہوگا!"
"میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ ہمیں آبادی کا رُخ کرنا چاہیئے" طالب علم نے افسردہ لہجے میں کہا۔
"تم نے کہا تھا! —— یہ تمہارا ہی حصّہ تھا تعلیم یافتہ جو ٹھہرے تم! —— مگر کہاں ہیں وہ آباد مقامات جن کا تم ذکر کر رہے ہو" سپاہی طالب علم پر برس پڑا۔
طالب علم نے جواب میں اپنے ہونٹ چبانے شروع کر دیئے۔ اور خاموش

ہو گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ بادل رنگا رنگ کے لباس بدل رہے تھے۔ شورے اور مٹی کی خوشبو نے ہماری بھوک کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ اور ایک ناخوشگوار سی لہر بدن میں دوڑ رہی تھی۔ منہ اور حلق خشک ہو گیا تھا دماغ سخت پریشانی میں گرفتار تھا۔ سر چکرانے لگا۔ اور عجیب قسم کے سیاہ دھبے آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگے۔ یہ دھبے کبھی گوشت کے بھنے ہوئے ٹکڑوں کی اور کبھی روٹیوں کی شکل اختیار کر لیتے ـــــ ذہن نے ان کی یاد تازہ کر دی اور یہ اصل معلوم ہونے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی خوشبو تک بھی آنے لگی۔ اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی پیٹ میں نوکیلا خنجر گھونپ رہا ہے۔ لیکن اب اس اذیت کے باوصف ہم بھیڑوں کے نشانات دیکھنے اور کسی پھلوں سے لدے ہوئے چھکڑے کے پہیوں کی آواز سننے کے لئے ادھر اُدھر نگاہ دوڑاتے اور کان کھولے چلتے رہے ـــــ مگر میدان خاموش اور سنسان تھا۔

اس پر تکان سے پیشتر شام کو ہم سب نے صرف دو سیر کچی روٹی اور پانچ تربوز کھائے تھے، ہمیں کوئی چالیس میل کے قریب چلنا پڑا تھا۔ خرچ آمدن کی نسبت زیادہ تھا۔ ہم مارکیٹ میں سو رہے تھے۔ کہ ہمیں بھوک نے آجگایا۔

طالب علم نے ہم سے کہا تھا کہ رات کو سونے کے بجائے کام کرنا چاہیئے اور رہی دوسری بات کہ کسی کی ملکیت پر ڈاکہ ڈالنا، سو وہ معاشرہ کے اصولوں

کے خلاف ہے، اس لئے میں اُس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میری خواہش انصاف کرنے کی ہے۔ میں یا وہ کوئی نہیں کر سکتا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ ہمارے اس مہذب زمانے میں لوگ بہت شائستہ اور نرم دل ہوتے جا رہے ہیں حتیٰ کہ اگر کسی پڑوسی کا گلا بھی کاٹنا ہو تو موقع کی مصلحت دیکھ کر یہ کام بھی نہایت سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ میرے اپنے گلے کے تجربے نے اخلاق اور تہذیب کے اس ارتقا کو میرے سامنے واضح طور پر ظاہر کر دیا ہے۔ اور میں قطعی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ دنیا کی ہر شے رُو بہ ترقی ہے — شراب خانوں عصمت فروشی کی دوکانوں اور زندانوں کی تعداد میں سالانہ اضافے اس ترقی کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں۔

چنانچہ اس طرح ہم اپنا لعاب دہن نگلتے اور آپس میں دوستانہ گفتگو کرتے ہوئے، تاکہ کسی حیلے ہمارے پیٹ کا درد کم ہو جائے اس سنسان میدان میں بڑھتے گئے۔ دل میں ایک موہوم اُمید لئے ہوئے سُرخ شفق کی طرف چلتے گئے!

ہمارے سامنے سورج اُن بادلوں کے پیچھے جن پر اُس کی شعاعیں زرنگاری کا کام کر رہی تھیں، غروب ہو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے چاروں طرف رات کی سیاہی افق کی وسعت کو تنگ کرتی ہوئی پھیل رہی تھی۔

"آگ جلانے کے لئے کچھ ایندھن تو اکٹھا کرو" سپاہی نے دفعتہً زمین پر سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اُٹھاتے ہوئے کہا "ہمیں آج کی رات میدان ہی

ہیں کاٹنا پڑے گی ۔۔۔ اوس خوب پڑے گی، خشک گوبر اور درختوں کی ٹہنیاں الاؤ کے لئے ٹھیک رہیں گی!"

ہم سڑک کے دونوں طرف بکھر گئے اور سوکھی گھاس اور ہر وہ چیز جو مل سکتی تھی اکٹھا کرنی شروع کر دی۔ ہر مرتبہ جب ہمیں زمین پر جھکنا پڑتا۔ ہمارے بدن میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوتی کہ زمین پر گر پڑیں اور مٹی کھانے کے لئے خاموش لیٹ جائیں ۔۔۔۔ سیاہ اور چکنی مٹی کھاتے رہیں، حتیٰ کہ اور کچھ نہ کھا سکیں اور پھر اسی حالت میں سو جائیں خواہ یہ نیند ابدی نیند ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس سے بیشتر کچھ کھائیں ضرور ۔۔۔۔ کوئی سی غذا، کوئی گرم گرم کھانا حلق سے اتر کر تلملاتے ہوئے اور بھوکے پیٹ میں پہنچ جائے ۔۔۔ اس معدے میں جو کسی چیز کو ہضم کرنے کی خواہش میں بیتاب ہوا جا رہا تھا۔

"کاش ہمیں کوئی جڑ ہی مل جاتی" سپاہی نے آہ بھر کر کہا "ایسی جڑیں بھی تو ہوتی ہیں جو غذا کا کام دے سکتی ہیں ۔۔۔ جن کو ہم کھا سکتے ہیں!"

مگر اس سیاہ اور ہل کی ہوئی زمین میں جڑوں کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اب جنوبی ممالک کی رات تیزی سے شفق پر غلبہ حاصل کر رہی تھی۔ سورج کی آخری شعاعیں ابھی غائب ہی ہوئی تھیں کہ تاریک اور نیلگوں آسمان میں تارے چمکنے لگے۔ آہستہ آہستہ رات کی سیاہی میدان کی وسعت کو تنگ بناتی ہوئی بڑھتی گئی۔

"بھائی، ہمارے بائیں طرف ایک آدمی لیٹا ہوا ہے!" طالب علم نے سپاہی سے آہستگی کے لہجے میں کہا

"آدمی!" سپاہی نے حیرت زدہ ہوکر دریافت کیا۔ "آخر وہ یہاں کیوں لیٹ رہا ہے؟

"جاؤ، اُس سے خود دریافت کرلو ـــــ اُس کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا جبھی تو اس طرح میدان میں پڑا ہے۔" طالب علم نے جواب دیا۔

سپاہی تھوکنے کے بعد ایک عزم سے بولا "تو چلو آؤ اُس کے پاس چلیں"

صرف طالب علم کی تیز نگاہیں ہی تاریکی میں سڑک کی دوسری طرف کوئی سو گز کے فاصلے پر ایک آدمی کو جو سیاہ ڈھیر کی صورت میں پڑا تھا پہچان سکتی تھیں۔ ہم ہل کی ہوئی زمین میں مٹی کے ڈھیلوں پر تیزی سے قدم اُٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ کھانا حاصل کرنے کی اس نئی اُمید نے ہماری بھوک کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا تھا۔ ہم اُس کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ مگر وہ بے حرکت پڑا رہا۔

"شاید یہ انسان نہیں ہے" سپاہی نے ہم سب کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے مایوسانہ انداز میں کہا۔ مگر فوراً ہمارے اندیشے غلط ثابت ہو گئے کیونکہ اُس ڈھیر میں جو زمین پر پڑا تھا ایک جنبش ہوئی اور اُس نے اُٹھنا چاہا۔ اب ہم نے

دیکھا کہ وُہ واقعی انسان ہے۔ جو گھٹنوں کے بل بیٹھا ہے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے۔

"میرے نزدیک نہ آنا ورنہ میں گولی چلا دُوں گا" ہم نے اُسے بھدّی اور لرزاں آواز میں یہ کہتے سُنا۔ اِس کے ساتھ ہی فضا میں بلبلی اُٹھنے کی تیز آواز گونجی۔

ہم یکایک ٹھیر گئے جیسے کسی نے حکم دیا ہے۔ کچھ عرصے تک ہم اُس ناخوشگوار پیشقدمی سے حیرت زدہ ہو کر خاموش کھڑے رہے۔

"بدمعاش!" سپاہی نے معنی خیز انداز میں زیرِ لب کہا۔

"ہُوں، پستول لئے سفر کرتا ہے ۔ یہ تو منہ کا نوالا معلوم نہیں ہوتا" طالب علم نے دانشمندانہ لہجے میں کہا۔

"او میاں!" ـــ ظاہر تھا کہ ہمارے رفیق سپاہی نے ضرور کوئی تدبیر سوچ لی ہے۔

اُس شخص نے کروٹ نہ بدلی اور پہلے کی طرح خاموش رہا۔

"اے میاں، دیکھو ہم تم کو بالکل نقصان نہ پہنچائیں گے۔ بس ہمیں کچھ کھانے کے لئے دیدو۔ تمہارے پاس روٹی وغیرہ ضرور ہو گی، بھائی ہمیں کچھ کھانے کے لئے دیدو۔ تمہیں مسیح کا واسطہ ہے ـــ لعنت ہو تم پر ـــ شیطان!" آخری لفاظ سپاہی نے اپنی ڈاڑھی کے اندر منہ ڈال کر آہستگی سے کہے ـــ وہ شخص

خاموش رہا۔

"کیا سُن بھی رہے ہو کہ نہیں؟" سپاہی نے بیچارگی اور غصّے میں کانپتے ہوئے پھر التجا کی "ہمیں پکڑ دو ــــ پھینک ہی دو۔ ہم تمہارے نزدیک نہ آئیں گے!"

"اچھا" اُس شخص نے بالآخر جواب دیا۔

اگر اُس نے ہمیں دلی خلوص سے "میرے عزیز بھائیو" کہہ کر پکارا ہوتا۔ اور ان لفظوں میں جذبات کا تمام تقدّس بھر دیا ہوتا۔ تو وہ ہم پر اُس قدر اثر انداز نہ ہوتے جتنا یہ غیر مہذبانہ، درشت اور خشک "اچھا" اثر انداز ہوا۔

"نیک آدمی! ہم سے خوف زدہ مت ہو" سپاہی نے اپنے چہرے کو متبسم کرتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ شخص تاریکی میں پچاس قدم کے فاصلے پر بیٹھا ہوا اُس کے اس تبسم کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ "ہم امن پسند لوگ ہیں۔ رُوس سے کیویؔ جا رہے ہیں۔ ہمارا سب روپیہ راستے میں خرچ ہو گیا ہے۔ ہم سب کھا پی بیٹھے ہیں۔ اب ہمیں فاقے سے دوسرا دن گذر رہا ہے!"

"لو، پکڑو" ہمارے محسن نے ہوا میں اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ اور ساتھ ہی ایک سیاہ سی چیز ہل کی ہوئی زمین پر ہمارے نزدیک ہی آ گری۔ طالب علم اس کو پکڑنے کے لئے لپکا۔

"لو اور پکڑو ــــ یہ رہی ــــ بس اب میرے پاس ختم ہو چکی ہے۔"

جب طالب علم نے اُن عجیب و غریب تحائف کو اکٹھا کیا تو معلوم ہوا کہ وُہ سیاہ روٹی کے چند خشک ٹکڑے تھے، جن کا مجموعی وزن کوئی دو سیر کے قریب ہوگا۔ یہ مٹی سے لت پت ہو رہے تھے۔ مگر یہ بات ہمارے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ خشک روٹی عموماً زیادہ تسکین دہ ہوا کرتی ہے۔ اسلئے اس میں تازہ روٹی کی نسبت نمی کم ہوتی ہے۔

"یہ لو تم اور یہ لو تم اور یہ میرے لئے" سپاہی نے بڑی احتیاط سے سب روٹی کا حصّہ دیتے ہوئے کہا" ـــ مگر ابھی حصّے برابر نہیں ہوئے۔ اس لئے "پروفیسر صاحب" مجھے آپ کے ٹکڑے سے کچھ حصّہ کاٹنا پڑے گا ورنہ یہ دوسرے حق میں بڑی نا انصافی ہوگی!"

طالب علم کو مجبوراً اپنے حصّے سے ایک ٹکڑہ دینا پڑا، جو وزن میں ایک اونس کے دسویں حصّے کے برابر تھا۔

میں نے اپنا ٹکڑہ منہ میں ڈال لیا۔ اور اُسے آہستہ آہستہ چبانا شروع ساتھ ہی میں اپنے جبڑوں کی قدرتی حرکت روکنے کی بے سُود سعی کر رہا جو اس وقت پتھروں کو چبانے کے لئے تیار تھے، مجھے اپنے نرخرے میں ایک تشنجی حرکت کے احساس اور ایسے چھوٹے چھوٹے لقموں سے آہستہ آہستہ کرنے کی کوشش میں ایک عجیب قسم کی مسرّت حاصل ہو رہی تھی۔ گرم اور نا بیان طور پر ذائقہ دار اور شیریں، اس روٹی کے ٹکڑے سے لقمہ بہ لقمہ حلق سے اُتر

جلتے ہوتے پیٹ میں پہنچتے ہی خون اور گوشت میں تبدیل ہوتے معلوم ہوتے تھے۔

میرا دل ایک ایسی ناقابلِ بیان اور حیات بخش مسرت سے معمور تھا جو اس روٹی کی نسبت کے لحاظ سے کہیں زیادہ تھی، جو میرے پیٹ کے اندر پہنچ رہی تھی میرے تمام جسم پر ایک خمار کی سی حالت طاری تھی، میں فاقہ کشی کے تکلیف دہ ایام کو بالکل بھول گیا۔ اس کے علاوہ میرے ذہن سے اپنے دوستوں کی یاد بھی محو ہو گئی اسلئے کہ میں اُن مسرت افزا خیالات میں غرق تھا جو اسوقت میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔

لیکن جب میں نے اپنی ہتھیلی سے روٹی کا آخری ٹکڑا منہ میں ڈالا تو میں نے محسوس کیا کہ میری بھوک اور بھی تیز ہو گئی ہے۔

"اس آدمی کے پاس کچھ اور بھی ضرور ہو گا۔۔ لعنت ہو اس پر!" سپاہی نے جو زمین پر بیٹھا اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کہا

"ضرور ہو گا۔۔۔ روٹی میں سے گوشت کی بو آ رہی تھی" طالب علم نے جواب دیا اور پھر ساتھ ہی دبی زبان میں کہا "کاش اس کے پاس پستول نہ ہوتی ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"مگر یہ ہے کون؟"

"ظاہر ہے کہ ہم ایسا ہی کوئی بھلا مانس ہو گا"

"ناپاک کُتا!" سپاہی نے فیصلہ کر دیا۔

ہم سب ایک دوسرے کے بالکل قریب بیٹھے اپنے محسن کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، جو پستول ہاتھ میں لئے خاموش بیٹھا تھا۔ اُس کی طرف سے کسی قسم کی آواز ہمیں سنائی نہ دے رہی تھی۔

رات کی تاریکی قوتیں رہی سہی روشنی پر غالب آگئیں۔ میدان پر قبر کی خاموشی طاری تھی۔ اس سکوت میں ہم ایک دوسرے کے سانس کی آواز بخوبی سُن سکتے تھے۔ کبھی کبھی بجو کی دردمیں ڈوبی ہوئی چیخ سنائی دیتی تھی۔ ستارے آسمان کے چمن کے زندہ پھول، ہمارے سروں کے اوپر چمک رہے تھے ——

ہماری اسوقت صرف ایک خواہش تھی کہ کچھ کھائیں!

میں فخر کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس شب میری حالت میرے اتفاقیہ رفیقوں سے نہ تو بُری تھی اور نہ اچھی۔ آخر کار میں نے یہ تجویز پیش کی ہمیں اُٹھ کر اُس شخص کے پاس جانا چاہیئے مگر بغیر کسی نقصان پہنچائے اُس سے کھانے کا سامان لے لینا چاہیئے۔ اگر وہ فائر کرتا ہے تو کرلے! وہ زیادہ سے زیادہ ہم میں سے صرف ایک کو نشانہ بنالیگا۔ جو چنداں ممکن نہیں اور اگر بفرض محال اس کی گولی کسی ایک کو لگ بھی گئی تو عموماً پستول کا چھرّہ مہلک زخم نہیں کرتا۔

"تو چلو پھر" سپاہی نے کود کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ طالب علم کوشش کے باوجود بڑی آہستگی سے اُٹھا۔ ہم دوڑ کر اُس شخص کی جانب بڑھے۔ طالب علم

ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

"محترم رفیق" سپاہی نے طنزاً چلا کے پکارا

ہمارا استقبال ایک زیرِ لب گنگناہٹ سے ہوا۔ پھر ساتھ ہی ـــ لبلبی دبنے کی آواز گونجی اور شعلہ بلند ہوا۔ اور گولی ہمارے کانوں کے قریب سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔

"نشانہ خطا گیا" سپاہی فرطِ مسرت سے چلا اٹھا اور ایک ہی جست میں اسے جا لیا۔ "ٹھہر، اے شیطان، اب چکھاتے دیتا ہوں تجھے مزا......

طالب علم اس کے تھیلے کی طرف لپکا مگر وہ شیطان ایکدم پیٹھ کے بل زمین پر لیٹ گیا، اور ہاتھ پھیلا کے ہانپنا شروع کر دیا۔

"ابے کیا ہو گیا تجھے؟ سپاہی نے حیران ہوتے ہوئے کہا" او ـــ ابے ـــ کچھ سن رہا ہے کہ نہیں؟ ـــ کیا تو نے اپنے آپ کو گولی تو نہیں مار لی؟"

"یہ رہا گوشت، ٹکیاں، اور روٹی ـــ کافی مقدار ہے بھائیو" طالب علم نے خوش ہو کر بلند آواز میں کہا۔

"تو جاؤ مرو، جہنم میں جاؤ۔ آؤ دوستو، ہم کھانا کھائیں" سپاہی چلایا

میں نے اس شخص کے ہاتھ سے پستول لے لی۔ اب اس نے کراہنا بند کر دیا تھا۔ اور خاموش پڑا تھا۔ پستول میں صرف ایک کارتوس اور باقی تھا۔

ہم اب پھر خاموشی سے کھانے میں مصروف تھے۔ اور وہ شخص بے حس و حرکت

پڑا تھا۔ اسوقت ہم اُس کی موجودگی سے بالکل غافل تھے۔

"بھائیو، کیا تم نے یہ سب کچھ واقعی اس روٹی کے لئے کیا ہے؟" ایک لرزاں اور پھٹی ہوئی بھدی آواز نے یک لخت ہم سے کہا۔ ہم چونک پڑے۔ طالب علم کھانستا ہوا زمین کی طرف جھک گیا۔ سپاہی نے اپنے مُنہ کا لقمہ نگلتے ہوئے اُس شخص کو بےطرح سُنانی شروع کر دیں۔

"او کتّے کی رُوح ــــ خدا کرے تیرا بدن خشک لکڑی کے چھلکے کیطرح پھُوٹ پھُوٹ پڑے۔ کیا تُو یہ خیال کرتا تھا کہ ہم تیری کھال ادھیڑنا چاہتے ہیں؟ تیری چمڑی ہمارے کس کام کی ــــ ملعون، پاجی، کمینے! ــــ پستول لئے لوگوں پر گولیاں چلاتا ہے ــــ شیطان کہیں کا!"

سپاہی اس دوران میں ساتھ ساتھ کھاتا بھی جارہا تھا جس کی وجہ سے اُسکی گالیوں کا پُورا زور شور بہت حد تک دب گیا تھا۔

"ٹھیر جا، ہم کھانا کھانے کے بعد تجھ سے نپٹ لیں گے!" طالب علم نے اُسے دھمکایا۔

اسپر سسکیوں اور آہ و زاری کی آواز رات کے سکوت میں پھیل گئی ــــ ہم ڈر گئے۔

"بھائیو، مجھے معلوم نہ تھا۔ میں ڈر گیا تھا۔ چنانچہ میں نے فائر کر دیا۔ میں نیو اینتھوس سے سمانسک جارہا ہوں...... آہ میرے خدا! جونہی آفتاب

غروب ہونے لگتا ہے، مجھے بخار چڑھ جاتا ہے ـــــ میری تیرہ بختی! اس بخار کے علاج کرانے کی خاطر ہی میں نے اتھوس کو خیرباد کہا تھا..... میں وہاں بڑھئی کا کام کیا کرتا تھا..... میں بڑھئی ہوں..... میری ایک بیوی اور دو چھوٹی چھوٹی بچیاں ہیں۔ جن سے جدا ہوئے مجھے..... قریب قریب چار سال گذر چکے ہیں..... بھائیو، تم سب کچھ کھا لو....."

"کوئی فکر نہ کرو، ہم تیرے کہنے کے بغیر ہی سب کچھ کھا لیں گے" طالب علم نے اس سے کہا۔

"آہ، میرے پروردگار! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم لوگ امن پسند اور معتدل ہو تو میں کبھی گولی نہ چلاتا..... جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار یہ دشت نما میدان ہے اور پھر تاریکی میں سوجھ کیا سکتا ہے..... مجھے معاف کر دو، بھائیو، میری خطا معاف کر دو!" وہ بول رہا تھا اور ساتھ رو بھی رہا تھا۔ اس کی رونی آواز لرزاں اور ذہنیت آفریں تھی۔

"بس بس اب چلاؤ نہیں" سپاہی نے حقارت سے کہا

"اس کے پاس کچھ نقدی بھی ضرور ہوگی!" طالب علم نے قیافہ لگایا۔

سپاہی نے اپنی آنکھیں نیم بند کر لیں۔ طالب علم کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "تم تو نجومی ہو ـــ چلو، اب آگ جلا کر سو رہیں!"

"اور اس کو یہیں پڑا رہنے دیں؟" طالب علم نے سپاہی سے دریافت کیا

"جہنم میں جائے یہ — کیا ہم اسے بھون کھائیں؟"

"ہے تو اسی کا مستحق! طالب علم نے اپنا نوکیلا سر ہلایا

ہم اپنا اکٹھا کیا ہوا ایندھن، جو بڑھئی کی دھمکی سے ہمارے ہاتھوں سے گر پڑا تھا، اٹھانے کے لئے روانہ ہوئے۔ منتشر کڑیوں کو جمع کرنے کے فوراً بعد ہم آگ جلا کر اس کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ آگ خاموش اور پرسکون رات میں ہمارے اس پاس کی کچھ جگہ کو روشن کرتی ہوئی آہستہ آہستہ سلگ رہی تھی۔ ہم پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہم ایک دفع اور کچھ کھانے کے لئے تیار تھے۔

"بھائیو" بڑھئی نے کہا وہ ہم سے کوئی تین قدم کے فاصلے پر لیٹا تھا کبھی کبھی اس کے گنگنانے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔

"کیوں، کیا ہے؟" سپاہی نے درشت لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

"کیا میں تمہارے پاس آگ تاپنے کے لئے آسکتا ہوں؟ — مجھے اپنی موت آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہے..... میرے جوڑ جوڑ میں شدت کا درد ہے..... آہ، خدا! میں کبھی گھر نہ پہنچ سکوں گا!"

"ادھر سرک آؤ" طالب علم نے اسے اجازت دے دی

بڑھئی آہستہ آہستہ رینگتا ہوا آگ کے پاس آگیا۔ وہ اس انداز سے اپنے بدن کو حرکت دے رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا، اسے اپنے اعضا کے ٹوٹنے کا خدشہ ہے

وہ دراز قد مگر بہت نحیف تھا۔ اس کا ہر عضو ارتعاش پذیر تھا۔ اور اُسکی دُھندلی آنکھوں سے درد و کرب کے آثار مترشح تھے۔ جو اُسے اندر ہی اندر ہلکان کر رہا تھا اُس کا افلاس زدہ چہرہ ہمارے الاؤ کی روشنی میں لاش کا سا زرد۔ مٹیالا اور ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اُس کا تمام جسم کانپ رہا تھا۔ یہ ارتعاش ہمارے دل میں نفرت آمیز ہمدردی کے جذبات پیدا کر رہا تھا۔ استخوانی ہاتھوں کو آگ کی جانب بڑھا کر اُن کو آپس میں رگڑتے وقت اُس کی انگلیوں کے جوڑ چٹخ رہے تھے۔ قصہ مختصر اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا جا سکتا تھا۔

"تم نے ایسی حالت میں پیدل سفر کیوں اختیار کیا ـــــ ہائے، کنجوسی!" سپاہی نے اُس سے دریافت کیا۔

"انہوں نے مجھے منع کیا تھا ... کہ سمندر کے راستے نہ جاؤ، صلاح دی تھی کہ خشکی کے راستے کریمیا ہوتا ہوا جاؤں ..... مگر بھائیو، میں اپنا سفر اب جاری نہیں رکھ سکتا ـــــ میں مر رہا ہوں ..... میں اس میدان میں تن تنہا مر جاؤں گا ..... پرندے میری نعش کو نوچ لیں گے ..... کسی کو خبر تک نہ ہو گی ..... میری بیوی اور میری لڑکیاں میری منتظر ہونگی .... میں اُنہیں خط لکھ چکا ہوں ..... اس میدان میں بارش میری ہڈیاں بہا کر لے جائے گی ..... آہ میرے پروردگار! ـــــ میرے پروردگار!!"

اُس کی آواز کسی زخمی بھیڑیئے کی دردناک چیخ پکار کے مانند تھی

"آہ، شیطان" سپاہی نے جست کر کے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ بک بک کس لئے لگا رکھی ہے تم نے۔ کیا تم ہمیں ایک لمحہ چین بھی لینے دو گے یا نہیں ـــــ مزا چاہتے ہو تو مر جاؤ مگر خدا کے لئے ذرا خاموش رہو ـــــ تمہاری ضرورت بھی کسکو ہے؟ ـــــ اب خاموش ہی رہنا"

"سر پہ ایک دھول نہیں جما دیتے!" طالب علم نے سپاہی کو صلاح دیتے ہوئے کہا۔

"چلو اب سو جائیں" میں نے کہا "اور سنو تم اگر آگ تاپنا چاہتے ہو تو خدا کے لئے زبان منہ میں ہی رکھنا"

"سن رہے ہو؟" سپاہی نے بڑھئی سے غصّے میں دریافت کیا "یہ خیال دماغ سے نکال دو کہ ہم تم پہ ترس کھا کر تمہاری تیمارداری کریں گے۔ اس لئے کہ تم نے ہمیں روٹی کا ٹکڑہ دیا تھا اور ہم پر فائر کیا تھا۔ تم مکمل شیطان ہو ـــــ یہ کام کوئی اور ہی کرے گا"

سپاہی نے اور کچھ نہ کہا اور اپنے آپ کو زمین پہ دراز کر دیا۔ طالب علم پہلے ہی سے لیٹا ہوا تھا۔ میں بھی لیٹ گیا۔ خوفزدہ بڑھئی جسم کو سکیڑتے ہوئے الاؤ کی طرف بڑھا۔ اور آگ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ میں اُس کے دہنے پہلو میں لیٹا اُس کے دانتوں کی رگڑ کی آواز کو سن رہا تھا۔ طالب علم اُس کے بائیں

طرف سکڑا ہوا تھا اور غالباً لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ سپاہی اپنے سر کو ہاتھوں کا سہارا دیئے آسمان کو تک رہا تھا۔

"کیسی سہانی رات ہے، کسقدر ستارے چمک رہے ہیں" تھوڑے عرصے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا" دیکھو ایک لحاف کی طرح معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔۔ جہاں نوردی کی اس زندگی کو میں واقعی پسند کرتا ہوں ــــ گو ایسی زندگی میں سردی کی شدت اور فاقہ کشی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ مگر آزادی تو ہے۔۔۔۔۔ تمہارا کوئی آقا نہیں اپنے کاروکردار کے تم خود مالک ہو۔۔۔۔ اگر اپنا سر بھی چاٹنا چاہو تو تمہیں کوئی روکنے والا نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ زندگی خوشگوار ہے! ــــ ایامِ فاقہ کشی نے میری طبیعت کو بگاڑ دیا تھا۔۔۔۔ مگر اب میں یہاں پر لیٹا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں، ستارے جھلملا رہے ہیں جیسا کہ وہ مجھ سے کہنا چاہتے ہیں، 'لیکوتن' کچھ پروا نہ کرو، جاؤ، سیاحت کرتے رہو مگر خیال رہے کسی کی غلامی قبول نہ کرنا۔۔۔۔ دل کسقدر مسرور ہے! ــــ میاں بڑھئی کہو، تمہارا کیا حال ہے؟۔۔۔۔ بھئی خفا مت ہونا ہم سے۔ اگر ہم نے تمہاری روٹی کھالی ہے تو کیا مضائقہ ہے؟ تمہارے پاس کچھ کھانے کو تھا اور ہم بھوکے تھے، چنانچہ ہم نے اسے کھالیا۔۔۔۔۔ مگر تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ تم نے ہم پر گولی چلائی تھی۔۔۔۔۔ تمہاری اس حرکت نے مجھے سخت برانگیختہ کر دیا تھا۔ اور اگر تم خود بخود زمین پر نہ گر پڑتے تو میں تمہیں اس گستاخی کا مزا چکھا دیتا۔۔۔۔۔ روٹی کا افسوس نہ کرو۔

پیری کو پہونچ کر تم کھانا خرید سکتے ہو..... مجھے معلوم ہے کہ تمہارے پاس نقدی ضرور موجود ہے..... کب سے بخار آ رہا ہے تمہیں؟"

ایک عرصے تک سپاہی کی بھدی اور کرخت آواز اور بڑھئی کی لرزاں گنگناہٹ میرے کانوں میں گونجتی رہی۔ رات ـــــ جو اب کاجل کی طرح سیاہ تھی، زمین پر اپنی پوری تاریکیوں کے ساتھ نیچے اُتر رہی تھی۔ میرے سینے کو فضا کی بھینی بھینی خوشبو فرحت بخش رہی تھی۔ آگ کی ہلکی روشنی اور اس کی گرمی جان بخش تھی.....

میری آنکھیں بند ہو گئیں

"اٹھو، جلدی کرو۔ چلو چلیں!"

میں گھبرا کر اُٹھا اور سپاہی کی مدد سے جو مجھے آستین پکڑ کر زور زور سے جھنجھوڑ رہا تھا فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو! اب تیزی سے قدم بڑھاؤ!"

اُس کے چہرے سے گھبراہٹ ہویدا تھی۔ میں نے اپنے گرد و پیش نگاہ دوڑائی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا اور اس کی ایک گلابی کرن بڑھئی کے ساکت اور مردہ چہرے پر پڑ رہی تھی..... اُس کا منہ کھلا تھا، اُس کی آنکھیں جو باہر کو بھری ہوئی تھیں ایک بے نور اور دہشت زدہ صورت میں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اُس کا کرتہ چھاتی کے مقام سے پھٹا ہوا تھا۔ اور وہ ایک غیر فطری انداز میں زمین پر اینٹھا پڑا تھا۔

"بہت دیکھ چکے، چلو اب میں جو کہتا ہوں اب چلو!" سپاہی نے میرا بازو کھینچ کر چلنے کو کہا۔

"کیا یہ مر چکا ہے؟" میں نے صبح کی ناخوشگوار تازگی اور سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"ہاں، مر چکا ہے، اگر تمہارا گلا گھونٹ دیا جاتا تو یقیناً تم بھی مر جاتے"

"تو کیا، یہ..... یہ طالب علم نے تو نہیں کیا؟" میں چلّا اُٹھا۔

"اس کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ کیا تم نے یا میں نے اسکو مارا ہے پھر؟..... یہ ہے پڑھے لکھوں کا حال..... اُس نے اس کو بڑی چالاکی سے ہلاک کر دیا ہے اور اپنے دوستوں کو آفت میں پھنسا کر چلتا بنا ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ ایسا غدّار ثابت ہوگا، تو کل ہی میں نے ایک ہی ضرب سے اُسکا کام تمام کر دیا ہوتا..... کنپٹی پر ایک گھونسہ جماتا اور دُنیا سے ایک رزیل اور بدکردار شخص ہمیشہ کے لئے کم ہو جاتا..... کیوں اب سمجھے کچھ کہ اُس نے کیا کر دیا ہے؟ اب بہتر یہی ہے۔ کہ یہاں سے بھاگ چلیں، پیشتر اس کے کہ ہمیں کوئی اس میدان میں دیکھ لے —— سمجھے کچھ؟ بہت جلد انہیں پڑھنی کی لاش مل جائے گی، اور وہ قاتل کے سُراغ میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور ہم ایسے آوارہ گردوں کو پکڑ کر طرح طرح کے سوالات پوچھیں گے، گو میں اور تم بالکل بے گناہ ہی ہیں..... یہ اور مصیبت ہے کہ اس کی پستول میری جیب میں پڑی ہے۔"

"پھینک دو اسے، پھینک دو!" میں نے اُسے صلاح دی

"پھینک دوں؟" سپاہی نے میری طرف غور سے دیکھتے ہُوئے کہا" وہ کیوں؟
یہ تو قیمتی چیز ہے۔ شاید یہ ہم بچ نکلیں! نہیں میں تو اُسے ہرگز نہ پھینکوں گا.....
اس کی قیمت تین روبل کے قریب ہو گی...... بھلا کون معلوم کر سکتا ہے۔ کہ اس
بے چارہ کے پاس کوئی ہتھیار بھی تھا یا نہیں..... اسمیں ایک گولی بھی ہے......
آہ! میں یہ گولی اپنے اس دغاباز دوست کے دماغ میں اتارنے کے لئے کس قدر
بے قرار ہوں! — خدا معلوم وہ اس بے چارے کا کتنا روپیہ لے بھاگا ہے؟....
لعنت ہو اُس پر!!"

اور بیچارے بڑھئی کی لڑکیوں کا کیا حشر ہو گا؟" میں نے سپاہی سے کہا۔

"لڑکیاں؟..... کس کی لڑکیاں؟ ہاں بڑھئی کی — کیوں، وہ جوان
ہو جائیں گی۔ اور ہم سے تو وہ شادی کرنے سے رہیں — ہم ان کے متعلق کیوں فکر کریں
چلو، بھائی، اب چلیں..... مگر جائیں کسطرف؟"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ بہت دور ایک سیاہ اور بلند پہاڑی کے اوپر سُورج چمک
رہا تھا۔

کیا دیکھ رہے ہو کہ وہ زندہ تو نہیں ہو گیا؟ بے خوف رہو، اب وہ اُٹھکر ہمارا
پیچھا نہ کرے گا...... یہ اپنے کام کا پُورا ماہر معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو تو اُس نے
اس غریب کو کس طرح سرد کیا ہے!...... کیسا شاندار رفیق تھا! اس نے ہمارے

ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا ہے . . . . آہ ! اب اخلاق روز بروز رُو بہ تنزل ہے لوگ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ سپاہی نے غمگین لہجے میں کہا

خاموش اور سنسان میدان سُورج کی روشنی سے معمور تھا۔ جو ہمارے گرد و پیش، افق پر آسمان کی نیلاہٹ کے ساتھ اس دلنواز انداز میں تحلیل ہو رہی تھی کہ اس وقت تمام سیاہ کاریاں اور غیر مُنصفانہ کام میدان کی اس عظیم الشان سادگی اور وسعت میں آسمان کے نیلے گنبد کے نیچے بالکل ناممکن معلوم ہوتے تھے۔

"بھائی! مجھے تو سخت بھوک لگ رہی ہے!" میرے ساتھی نے ہاتھ سے سیگرٹ بناتے ہُوئے کہا۔

"مگر سوال ہے کہ ہم کھائیں گے کیا اور کہاں اور کب کھائیں گے!"

یہی حل طلب چیز تھی — ایک معمّا!

x x x x x x x x x x x x

یہاں تک پہنچ کر ہسپتال میں اُس شخص نے میرے ساتھ والے جو بستر پر لیٹا ہوا تھا اپنا قصّہ یوں ختم کر دیا۔ یہ داستان کا خاتمہ ہے — میں اور سپاہی گہرے دوست بن گئے۔ ہم دونوں نے کارس کے علاقے تک ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ وہ ایک رحمدل اور تجربہ کار آدمی تھا۔ میری نظروں میں اُس کی بڑی عزت تھی۔ ایشیائے کوچک پہنچ کر ہم ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

"کیا تمہیں وہ بڑھئی اب بھی یاد آتا ہے؟" میں نے اُس سے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے آپ نے دیکھا ہے بلکہ جیسا آپ نے سُنا ہے!"

"اور کچھ نہیں۔ کسی قسم کا احساس بھی نہیں؟"

اسپر وہ ہنسنے لگا۔

"مجھے اس واقعے کے متعلق کس طرح احساس ہو؟ بڑھئی پر جو کچھ گذرا اُسکا میں ذمہ دار نہیں اور مجھ پر جو کچھ گذرا اُس کے آپ ذمہ دار نہیں اور سچ تو یہ ہے کسی چیز کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں۔ اس لئے کہ ہم سب یکساں ہیں، یعنی درندے!"

چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ

ہم تعداد میں چھبیس تھے ۔ چھبیس متحرک مشینیں، ایک مرطوب کوٹھڑی میں مقید، جہاں ہم صبح سے لیکر شام تک بسکٹوں کے لئے میدہ تیار کرتے۔

ہماری زندان نما کوٹھڑی کی کھڑکیاں جن کا نصف حصہ آہنی چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور شیشے گرد و غبار سے اَٹے ہوئے تھے، اینٹوں اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی کھائی کی طرف کھلتی تھیں۔ اس لئے سورج کی شعاعیں ہم تک نہ پہنچ سکتی تھیں۔

ہمارے آقا نے کھڑکیوں کا نصف حصّہ اس لئے بند کرا دیا تھا کہ ہمارے ہاتھ اُس کی روٹی سے ایک لقمہ بھی غریبوں کو دینے کے لئے باہر نہ نکل سکیں، یا ہم اُن بھائیوں کی مدد نہ کر سکیں، جو کام کی قلّت کی وجہ سے فاقہ کشی کر رہے تھے۔

ہمارا مالک، ہمیں "جیل کے غلاموں" کے نام سے پکارتا اور کھانے کے لئے گوشت کے بجائے رتھڑیاں دیتا۔

اس سنگین زندان کی چھت تلے، جو دھوئیں کی سیاہی اور مکڑیوں کے جالے سے اٹی ہوئی تھی، ہم نہایت تکلیف دہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس چار دیواری میں جو کیچڑ اور میدے کے خمیر سے بھری ہوئی تھی ہماری زندگی ـــ غم و فکر کی زندگی تھی۔

پوری نیند اور آرام کئے بغیر ہم ہر روز صبح پانچ بجے بیدار ہو کر نیم خوابی ہی کی حالت میں اس میدے سے بسکٹ تیار کرنے لگ جاتے جو ہمارے دوسرے رفیق نے ہمارے سونے کے وقت تیار کیا ہوتا تھا۔

اس طرح صبح سے لیکر رات کے دس بجے تک ہم میں سے کچھ تو بسکٹوں کے لئے خمیر تیار کرتے رہتے اور کچھ میدہ گوندھتے رہتے۔ اسی دوران میں اُبلتے ہوئے پانی کی آواز اور بھٹی میں نانبائی کے سُلاخ ڈالنے کا شور ہمارے کانوں میں گونجتا رہتا۔ صبح سے لیکر شام تک بھٹی جہنم کی طرح دہکتی رہتی اور اس کی سُرخ شعاعوں کا عکس دیوار پر اس طرح رقص کرتا معلوم ہوتا، گویا وہ ہم بدنصیبوں کو دیکھکر خامو ہنسی ہنس رہا ہے۔

وہ بڑی بھٹی کسی دیو کے بد وضع سر کے مشابہ تھی، جو اپنے بڑے حلق سے آگ اُگل رہا ہو، یا ہمارے سامنے جہنم کی آگ کی طرح جھلسا دینے والے گرم سانس لے

ہم گفتگو میں مشغول ہو گئے جس میں اتفاق آرا سے سپاہی خوش خلق قرار دیا گیا۔ سپاہی خوش طبع اور حلیم تھا۔ اُس نے ہم سے اس طرح گفتگو کی گویا وہ ہمیں میں سے ہے ـــــ ہمارے پاس آجتک کوئی ایسا شخص نہ آیا تھا۔ جس نے ہمارے ساتھ اس قسم کی دوستانہ گفتگو کی ہو۔

عرصے تک اُس کی اُن تازہ کامیابیوں کے متعلق ذکر کرتے رہے۔ جو اُسے فیکٹری کی لڑکیوں کی محبت جیتنے میں حاصل ہوئی تھیں ـــــ اُن لڑکیوں کی محبت جو ہماری طرف دیکھکر نفرت سے منہ پھیر لیتیں جیسے اُنہیں ہم سے کوئی غرض ہی نہیں اور جن کو ہم للچائی للچائی نظروں سے دیکھتے اور وہ صحن میں مختلف قسم کے خوبصورت لباس پہنکر گذر رہی ہوتیں۔

نانبائی نے دفعتہً دیگر آواز میں کہا" ٹینیا کی نسبت تمہارا کیا خیال ہے۔ کہیں وہ سپاہی کی گرفت میں نہ آجائے؟"

اِن الفاظ نے ہم پر بہت اثر کیا۔ اس لئے ہم خاموش رہے

ٹینیا کا خیال ہمارے دماغ سے تقریباً محو ہو چکا تھا یعنی سپاہی کے خوبصورت اور مضبوط جسم نے اُسے ہماری آنکھوں سے کچھ عرصے کے لئے اوجھل کر دیا تھا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد بحث شروع ہو گئی۔ ہم میں سے بعض کو یقین تھا کہ ٹینیا معمولی سپاہی کی خاطر اپنی عصمت کو ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دیگی مگر بعض کا خیال تھا کہ وہ سپاہی کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

ہم میں سے بعض نے رائے دی کہ اگر سپاہی اپنی خواہشات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کرے تو اُس کی پسلیاں کچل ڈالی جائیں۔ اس بحث کے اختتام پر یہ فیصلہ ہوا کہ ہم سب ٹینیا کی حفاظت کریں۔ اور اُسے آنیوالے خطرے سے آگاہ کریں۔

ایک زمانہ گذر گیا۔

سپاہی حسبِ معمول اپنے کام میں مشغول رہا۔ اس دوران میں وہ ہمارے کارخانے میں کئی دفعہ آیا۔ مگر چھوکریوں پر فتح پانے کے قصّوں کے متعلق کسی قسم کی گفتگو نہ ہوئی۔

ٹینیا بھی ہر روز صبح کے وقت اپنے بسکٹوں کی خاطر آتی۔ اُس کا رویّہ حسبِ دستور ویسا ہی دوستانہ تھا۔ ہم نے اُس کو سپاہی کے متعلق آگاہ کرنا چاہا۔ مگر اُن بھبتیوں سے جو وہ اُس پر اُڑاتی، ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ اُس کے ہتھے نہیں چڑھ سکتی۔

ہمیں اپنی ننھی دوشیزہ ٹینیا پر ناز ہوتا۔ جب ہم ہر روز سپاہی کے ساتھ کوئی نہ کوئی نئی لڑکی دیکھتے۔ ٹینیا کے اس باوقار رویّے نے ہمارے حوصلوں کو اور بھی بڑھا دیا۔ اب ہم اُس کی عصمت کے نگہبان، سپاہی کو حقارت کی نظروں سے دیکھنے لگے اس کے برعکس ٹینیا کی محبت و عظمت ہمارے دلوں میں روز بروز بڑھتی گئی۔

ایک روز سپاہی شراب سے مخمور، ہنستا ہوا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ جب ہم

نے اُس کے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو اُس نے جواب دیا" دوچھوکریاں مجھ پر آپس میں لڑ رہی تھیں ـــــ انہوں نے ایک دوسرے کو کس طرح ذلیل کیا ـــــ ہا ہا ہا! ـــ ایک دوسری کے بال پکڑ کر زمین پر گر پڑیں ـــــ ہا ہا ہا! ـــــ اور دیوانی بلیوں کی طرح نوچنا شروع کر دیا ـــــ اور میرا ہنسی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ مجھے تعجب ہے کہ عورتیں صاف لڑائی کیوں نہیں لڑتیں ـــــ نوچنے سے فائدہ؟"

وہ بنچ پر بیٹھا نہایت تندرست اور صاف ستھرا نظر آ رہا تھا۔ ہم خاموش تھے اس لئے کہ اُس کی آمد ہمیں ناگوار گذر رہی تھی۔

"میں اس معمّے کو حل کرنے سے قاصر ہوں۔ خُدا جانے عورتیں مجھ پر فریفتہ کیوں ہیں ـــ بس آنکھ جھپکنے کی دیر ہے ـــــ"

یہ کہتے وقت سپاہی اپنے سفید بازوؤں کو ہوا میں حرکت دے رہا تھا۔ اور ہماری طرف دوستانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ہمارے رفیق نانبائی نے غصّے کی وجہ سے آہنی سلاخ کو بھٹی میں تیزی سے حرکت دیتے ہوئے کہا" ننھے ننھے پودوں کا اکھاڑنا کوئی جوانمردی نہیں، مزا تو جب ہے کہ کسی مضبوط درخت کو گرایا جائے"

سپاہی نے دریافت کیا" تم مجھ سے مخاطب ہو کیا؟"

"ہاں، تمہیں سے مخاطب ہوں!"

"اس سے تمہارا مطلب؟"

"کچھ بھی نہیں ـــــ کچھ بھی نہیں!"

ٹھیرو، ٹھیرو، وہ کونسا مضبوط درخت ہے، جس کا تم ذکر کر رہے تھے؟"

نانبائی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور بھٹی سے پکے ہوئے بسکٹ نکالنے میں مشغول رہا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ سپاہی اور اُس کی گفتگو کو بالکل بھول چکا ہے۔ مگر سپاہی بہت بے چین ہوگیا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر بھٹی کے قریب آیا۔ اور بولا "کہو تو ـــــ کس عورت کا ذکر کر رہے تھے؟ ـــــ تم نے میری ہتک کی ہے، کوئی عورت مجھ پر غالب نہیں آسکتی ـــــ"

اس کی گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ نانبائی کے اس جملے سے سخت ناراض ہوگیا ہے۔ غالباً اُس کو اس بات پر فخر تھا کہ اُس میں عورتوں کو مسخر کرنے کا وصف بدرجۂ اُتم موجود ہے، ورنہ درحقیقت سوائے اس وصف کے اُس شخص میں زندگی کے متعلق کوئی چیز بھی موجود نہ تھی۔ اسی ایک رہے سہے وصف کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو زندہ انسان کہلانے کا مستحق ہوسکتا تھا ـــــ دنیا میں ایسے افراد موجود ہیں جو بیماری کو خواہ وہ رُوحانی ہو یا بدنی زندگی کا ایک بیش قیمت جزو تصور کرتے ہوئے اُس کی تمام عمر پرورش کرتے رہتے ہیں۔ اور اسی میں اپنی زندگی کا راز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ایسی زندگی عموماً تکلیف دہ ہوا کرتی ہے۔ وہ اس پر از مصائب زندگی کے متعلق دوسروں سے شکایت ضرور کرتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ اپنے ہم جنسوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکیں اور اسطرح وہ انہیں ہمدردانہ نگاہوں

سے دیکھیں۔ اگر ایسے افراد سے یہ بے چینی، یہ کرب اور تکلیف چھین لی جائے۔ اُن کے درد کی دوا کر دی جائے تو وہ پہلے کی طرح شاد ماں نہ رہیں گے۔ اس لیے کہ اُن کی زندگی کا آخری سہارا اُن سے علیٰحدہ کر دیا گیا — اب وہ کھوکھلے برتن کے مانند ہوں گے۔

بعض اوقات انسان کی زندگی اس قدر مفلس اور نادار ہوتی ہے، کہ وہ بے مقصد کسی معیوب چیز ہی سے محبت کرنے لگ جاتا ہے، اور اُسی کے بھروسے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اکثر لوگ صرف دماغی بیکاری کی وجہ سے گناہ کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

سپاہی سخت ناراض ہو گیا تھا۔ وہ نانبائی کیطرف لپکا اور درشت لہجے میں بولا "میں جو بار بار کہہ رہا ہوں کہ بولو — کس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو؟"

نانبائی نے سپاہی کی طرف اچانک مڑتے ہوئے کہا "کہوں پھر؟"

"ہاں، ہاں!"

"کیا تم ٹینیا کو جانتے ہو؟"

"کیوں؟"

"بس وہی لڑکی ہے — اُسے قابو میں لانے کی کوشش کرو"

"میں؟"

"ہاں، ہاں تم!"

"یہ تو بالکل معمولی بات ہے"۔

"ہم بھی دیکھیں کیسے؟"

"تو پھر دیکھ لوگے ـــــ ہا ہا ـــــ!

"وہ تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھے گی!"

صرف ایک مہینے کی مہلت چاہتا ہوں"

"شیخ چلّی مت بنو، میاں سپاہی!"

"اچھا چودہ روز سہی۔ اس کے بعد تم دیکھ لینا ـــــ کیا نام لیا تھا؟ ـــــ ٹینیا ـــــ"

"اب جاؤ تم کام میں حارج ہو رہے ہو"

"بس چودہ روز، اور وہ میرے قابو میں ہوگی ـــــ تمہاری قسمت!"

"میں کہتا ہوں، یہاں سے دُور ہو جاؤ!"

یہ کہہ کر نانبائی وحشیوں کی طرح غضبناک ہو گیا۔ اس حالت کو دیکھ کر سپاہی سخت حیران ہوا اور خاموشی سے یہ کہتا ہوا وہاں سے چلا گیا "اچھا!"

اس بحث کے دوران میں ہم سب خاموش رہے۔ اس لئے کہ ہم اُن کی باہم گفتگو کو بہت غور سے سُن رہے تھے۔ لیکن جونہی سپاہی رُخصت ہوا۔ ہمارے درمیان گفتگو کا ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ ہم میں سے ایک نے چلا کر نانبائی سے کہا:۔

نانبائی نے تندی سے جواب دیا۔" کام کیئے جاؤ اپنا ـــــ سُنا ہے یا نہیں؟"

ہمیں دراصل اس امر کی فکر لاحق ہو رہی تھی کہ چونکہ سپاہی اپنے الفاظ کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس لیئے لازم طور پر ٹیٹنیا کی عصمت خطرے میں ہے۔

مگر باوجود اس کے ہم اس بحث کا نتیجہ دیکھنے کے لیئے سخت بیقرار تھے ـــ اس بحث کا نتیجہ جو کسی حالت میں بھی خوشگوار نہ تھا۔

"کیا ٹینیا سپاہی کے مقابلے کی تاب لاسکیگی" اس سوال پر ہم سب بیک زبان چلا اُٹھے جیسے ہمیں اُس پر پوری طرح بھروسا ہو" ننھی ٹینیا ضرور ثابت قدم رہے گی!"

ہمیں اپنے ننھے دیوتا کی ثابت قدمی اور استقلال کا امتحان لینے کی عرصے سے خواہش تھی، لیکن ہم آپس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ ٹیٹنیا اِس امتحان میں ضرور سُرخرو ہو گی۔

اس دن سے ہماری زندگی عجیب قسم کی ہو گئی جس سے ہم بالکل ناآشنا تھے آپس میں پہروں بحث کرتے رہتے جیسے ہم پہلے سے زیادہ عقلمند اور ذی فہم بن گئے ہیں، اور ہماری گفتگو کچھ معنی رکھتی ہے۔ اب ہمیں معلوم ہو رہا تھا کہ ہم شیطان کے ساتھ بازی لگا رہے ہیں، اور ٹیٹنیا ہماری طرف سے داؤ ہے۔

جب ہم نے کیک بنانے والے نانبائی سے یہ خبر سُنی کہ سپاہی نے ٹینیا کا پیچھا کرنا شروع کر دیا ہے تو ہمیں سخت رنج پہونچا اور ہم اُس رنج کو مٹانے کے لئے اس قدر محو تھے کہ ہمیں یہ تک معلوم نہ ہوا کہ آقا نے ہماری بے چینی اور اضطراب کا فائدہ اُٹھاتے ہُوئے میدنے میں تیس سیر کا اضافہ کر دیا ہے۔

اس اضطراب کے دوران میں ٹینیا کا نام ہر وقت ہمارے ورد زبان ہوتا اور ہم ہر روز صبح کے وقت غیر معمولی بے صبری کے ساتھ اُس کا انتظار کیا کرتے۔

گو وہ ہر روز ہمارے پاس آتی مگر ہم نے سپاہی والی تکرار کا اُس کے ساتھ ذکر تک نہ کیا۔ اور نہ اُس سے کسی قسم کے سوالات کئے، بلکہ حسب معمول جذبۂ اُلفت سے ملتے رہے۔ مگر اب اس جذبۂ اُلفت میں کسی نئی چیز کی جھلک تھی — تیز تجسّس کی جھلک — فولاد کے پھل کے مانند تیز اور سرد!

نانبائی نے صبح کے وقت اپنا کام شروع کرتے ہُوئے کہا "دوستو! میعاد آج کے روز پُوری ہو جائے گی!"

ہمیں اس سے پیشتر ہی اس چیز کا علم تھا۔ مگر بھی یہ سُن کر ہم سر سے پاؤں تک کانپ گئے۔

نانبائی نے گفتگو جاری رکھتے ہُوئے کہا "وہ ابھی ابھی آئے گی، ذرا غور سے دیکھنا اُسے!"

ہم میں سے ایک نے پُرسوز لہجے میں کہا" — جیسے اُس کی آنکھیں کچھ بتا سکیں گی ؟"

اس پر بحث چھڑ پڑی ، آج کے روز ہمیں معلوم ہو جانے والا تھا کہ برتن جس میں ہم سب اپنے دل رکھے ہوئے تھے ، کتنا صاف اور بے لوث ہے ، صرف آج کی صبح ہم کو ایسا معلوم ہونے لگا ۔ جیسے ہم کوئی بڑا کھیل کھیل رہے ہوں جس میں ہمیں اپنے معبود کے کھو جانے کا اندیشہ ہو ۔

گذشتہ چند دنوں سے ہم سُن رہے تھے ۔ کہ سپاہی حصول مقصد کے لئے ٹینیا کے پیچھے سائے کی طرح لگا ہوا ہے ۔ ٹینیا حسب معمول بسکٹوں کے لئے ہر روز آتی مگر ہم اس سے سپاہی کے متعلق کسی قسم کا استفسار نہ کرتے — ہم خود متعجب تھے کہ کیوں ؟

آج کے روز بھی ہم نے اُس کی آواز سُنی " ننھے قیدیو ، میں آگئی ہوں ....."

اس پر ہم سب آگے بڑھے اور جب وہ اندر آگئی تو ہم خلاف معمول اُسے خاموشی سے ملے ، گو ہماری آنکھیں اُس پر جمی ہوئی تھیں مگر ہمیں معلوم نہ تھا کہ سلسلۂ کلام کیونکر شروع کریں — ہم خاموشی اور حسرت کی تصویر بنے اُس کے سامنے کھڑے تھے ۔

اس انوکھے اور خلافِ معمول استقبال کو دیکھ کر وہ سخت حیران ہو گئی — دفعتۂ اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا ۔ بے چین و مضطرب وہ دھیمی آواز میں

کہنے لگی:-

"تمہیں آج کیا ہوگیا ہے۔"

نانبائی نے دردانگیز لہجے میں کہا "تم اپنی سناؤ؟"

"اپنی؟ — کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں!"

"تو چلو مجھے بسکٹ دو، ذرا جلدی کرنا!"

اس سے قبل اس نے آج تک اتنی پھرتی نہ دکھائی تھی۔

نانبائی نے ٹینیا سے آنکھیں جدا نہ کرتے ہوئے کہا، "تم جلدی کیوں کر رہی ہو؟"

اس پر وہ دفعتہً مڑی اور دروازے سے باہر بھاگ گئی

نانبائی نے اپنی سلاخ پکڑی اور بھٹی کی طرف جاتے ہوئے دبی زبان میں کہنے لگا۔ "اس کا مطلب ہے — کہ وہ اب اس کی ہے — آہ، یہ سپاہی — حرامزادہ — بدمعاش......"

اس پر ہم بھیڑوں کے گلے کی طرح اپنے شانوں کو ہلاتے ہوئے میز کی طرف بڑھے اور خاموشی سے کام کرنا شروع کر دیا۔ ہم میں سے کسی نے خود کو تسلی دیتے ہوئے کہا "لیکن کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے......!"

نانبائی نے چیختے ہوئے جواب دیا۔ "بس، بس!! — اب بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

• •

• •

ہمیں معلوم تھا کہ نانبائی عقلمند ہے ـــ ہم سے کہیں عقلمند۔ اس لئے کہ اُس کے چلّانے سے ہم نے اندازہ کر لیا کہ وہ سپاہی کی فتح اور کامیابی کا اعتراف کر رہا ہے۔ یہ خیال کرتے ہُوئے ہم نے اپنے آپ کو اور زیادہ مصیبت زدہ اور بے چین پایا۔

بارہ بجے یعنی دوپہر کے کھانے کے وقت سپاہی آیا، اور حسبِ معمول خوش وخرم، وہ ہماری نظروں سے نظریں مل ملا کر دیکھنے لگا۔ اور پُر فخر لہجے میں بولا

"معزز دوستو! اگر چاہتے ہو کہ مَیں تمہیں اپنی کامیابی کا نمونہ دکھاؤں تو صحن کے ساتھ والے کمرے میں جا کر کھڑکیوں میں سے جھانک کر دیکھو ـــ سمجھ گئے!"

سپاہی کے کہنے پر ہم صحن کے ملحقہ کمرے میں چلے گئے۔ اور اپنے چہرے کھڑکیوں کے روزنوں کے ساتھ جما دئے۔ ہمیں بہت عرصے تک انتظار کرنا پڑا۔ کیوں کہ جلد ہی ٹینیا تیز قدم اٹھاتی ہُوئی صحن کے گڑھوں کے پاس سے جو کیچڑ اور برف سے بھرے ہُوئے تھے۔ گذری۔ اس کے چند منٹ بعد سپاہی نمودار ہُوا۔ اُس کا رُخ ٹینیا کی طرف تھا۔ بڑے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔ سیٹی بجاتا ہُوا، وہ بھی ٹینیا کی طرح ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ـــ اسی اثنا میں بارش گرنا شروع ہو گئی اور ہم بارش کے قطروں کو جو گڑھوں میں گر کر عجیب قسم کا شور پیدا کر رہے تھے خاموشی سے دیکھنے لگے۔

بارش کی وجہ سے آج کا دن، بہت اداس اور مرطوب تھا۔ مکان کی چھتوں

پر برف کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور زمین کیچڑ سے لتھپت ہو رہی تھی۔ بارش سسکیاں لیتی ہوئی زمین پر گر رہی تھی۔

گو ہمیں اس سردی میں اس طرح کھڑے رہنا ناگوار گذر رہا تھا۔ مگر چونکہ ہم ٹینیا کی بے وفائی پر سخت برانگیختہ تھے، کہ اُس نے ایک معمولی سپاہی کیخاطر ہم سب کو چھوڑ دیا۔ اس لئے ہم جلّادوں کی سی ہولناک خاموشی سے اُسکا انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر کے بعد ٹینیا واپس لوٹی۔ اُس کی آنکھیں — ہاں اُس کی آنکھیں کسی نامعلوم مسرت و انبساط سے چمک رہی تھیں، ہونٹ مسکرا رہے تھے اور جھومتی ہوئی پھلی آ رہی تھی جیسے خواب میں ہو۔

ہم اس منظر کو خاموشی سے نہ دیکھ سکے۔ دروازے سے نکل کر صحن کی طرف دیوانہ وار بھاگے ہوئے گئے اور اسپر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ ہمیں اس حالت میں دیکھ کر وہ کانپی اور ٹھیر گئی جیسے وہ کیچڑ میں گڑ گئی ہو۔ ہم سب اُس کے گرد جمع ہو گئے اور بغیر کچھ کہے سُنے جی بھر کے لعن طعن کی اور شرمناک سے شرمناک گالیاں سُنائیں۔

ہم نے ایسا کرتے وقت اپنی آوازوں کو زیادہ بلند نہ ہونے دیا۔ بلکہ اُس موقع سے اچھی طرح فائدہ اٹھاتے رہے۔ کیونکہ ہمیں یقین تھا۔ کہ ہمارے درمیان گھری ہوئی وہ کہیں نہیں جا سکتی اور ہم جتنا عرصہ چاہیں اپنا غصّہ نکال سکتے ہیں۔

حیرت یہ ہے کہ ہم نے اُسے مار پیٹ نہ کی!

وہ ہمارے درمیان گھری ہوئی، ہماری گالیوں کو خاموشی سے سُن رہی تھی — اور ہم گالیوں اور طعنوں کے ذریعے اپنے جلے دل کی آگ اُگل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد اُس کے چہرے کا رنگ اُتر گیا۔ اُس کی نیلگوں آنکھیں جو کچھ عرصہ پہلے فرطِ مسّرت سے چمک رہی تھیں اب پھٹی پھٹی معلوم ہونے لگیں، اُس کی چھاتی متلاطم تھی اور ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔

ہم اس کے گرد حلقہ بنائے، اپنے انتقام کی آگ بجھا رہے تھے، اس لئے کہ اُس نے ہمیں دھوکا دیا تھا، وہ ہماری تھی۔ چنانچہ ہم نے اُس کی خدمت میں اپنے دل پیش کئے — گو وہ بھکاری کے ٹکڑے سے زیادہ قیمتی نہ تھے مگر اُس نے اُن بیسیوں دلوں کو سپاہی کی خاطر ٹھکرا دیا۔

ہم اُسے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ اور وہ خاموشی سے — اُس جانور کی طرح جیسے شکاریوں نے آلیا ہو، پھٹی ہوئی آنکھوں سے، سرتاپا ارتعاش، ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس موقعے پر اور لوگ بھی جمع ہو گئے — ہم میں سے ایک نے ٹینیا کی آستین پکڑ کر کھینچ کی۔ جب اُس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی۔ اور اپنے سر کو ذرا اوپر اُٹھا کر، بالوں کو سنوارتے اور ہماری طرف گھورتے ہوئے دفعتہً بولی" اونہہ — جیل کے ذلیل جانور!"

یہ کہہ کر وہ ہمارے پاس سے بغیر کسی جھجک کے گذر گئی، جیسے ہم اُس کے

• •

• •

راستے میں بالکل حائل نہ ہوں ـــــ اُس کی اس دلیری سے ہمیں اس بات کی جُرأت نہ رہی کہ اُسے روک لیں۔

ہمارے پاس سے گذرتے ہُوئے وہ حقارت آمیز لہجے میں بولی "کمینے ـــ ناپاک انسان!" یہ کہتے ہُوئے وہ ہماری نظروں سے غائب ہوگئی اور ہم، صحن میں کیچڑ اور برف کے تودوں کے درمیان، موسلا دھار بارش میں، سُورج سے محروم آسمان تلے کھڑے رہے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم خاموشی سے اپنے سنگین قفس میں چلے آئے سُورج کی جان بخش شعاعیں حسبِ معمول ہم تک کبھی نہ پہونچیں ـــ ٹینیا پھر کبھی نہ آئی۔

خان اور اُسکا بیٹا

"ایک زمانے کا ذکر ہے، کہ کریمیا میں ایک خان رہتا تھا۔ اس کا نام موسولیما العصرب تھا۔ اُس کا بیٹا تولبک الگالا کے نام سے پُکارا جاتا تھا۔"

ان تمہیدی الفاظ سے اندھے تاتاری فقیر نے درخت کے خاکستری تنے سے پیٹھ لگا کر عہدِ رفتہ کی داستان سنانی شروع کی۔ اس داستان گو فقیر کے اردگرد تاتاریوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ جو شوخ رنگ کے کپڑے اور کامدار ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ یہ لوگ حلقہ بنا کر اُن بکھرے ہوئے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ جو کسی قدیم خان کے محل سے جُدا ہو کر منتشر ہو رہے تھے۔ شام کا وقت تھا اور سورج آہستہ آہستہ سمندر میں غروب ہو رہا تھا۔ اُس کی عنابی کرنیں کھنڈرات کے آس پاس اُگے ہوئے درختوں کے سبز پتوں کو چیرتی ہوئیں درخشاں دھبوں کی صورت

میں کائی سے ڈھکے ہوئے پتھروں اور بل کھاتی ہوئی ہری بیلوں پر پڑ رہی تھیں ہوا بوڑھے درختوں کی شاخوں میں ترنم ریزیاں کر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پانی کی غیر مرئی ندیاں فضا میں بہہ رہی ہیں۔ اندھے فقیر کی آواز دھیمی اور لرزاں تھی، اُس کے پتھرائے ہوئے چہرے کی جھریوں سے سوائے آسودگی کے اور کچھ مترشح نہ تھا۔ لفظ جو اُسے رٹے ہوئے تھے یکے بعد دیگرے بڑی روانی سے نکل رہے تھے۔ یہ سامعین کی آنکھوں کے سامنے از منۂ رفتہ کی ایک تصویر کھینچ رہے تھے۔

"خان گو ضعیف العمر تھا مگر اُس کے حرم میں بے شمار عورتیں تھیں۔ یہ بوڑھے خان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ اس لئے اُس کی محبت میں گرفتار تھیں، کہ اُس کی رگوں میں شباب کی قوت ابھی برقرار تھی اور اُس کے بوسے اور اس کی دلنوازیاں محبت کی پیش سے معمور ہوتی تھیں۔ عورتیں صرف اُسی مرد سے اُلفت کریں گی، جسکا تلطف قوی ہو، خواہ اُس کے بال سپید ہی کیوں نہ ہو رہے ہوں، یا اسکا چہرہ جھرّیوں سے بدنما ہی کیوں نہ ہو رہا ہو۔ حُسن قوت میں مضمر ہے نہ کہ گداز جسم اور گلاب آسا گالوں میں۔

یہ سب عورتیں خان سے محبت کرتی تھیں، مگر اُس کی منظورِ نظر صرف ایک قیدی لڑکی تھی جو بنیر کے ڈھلوانوں کی پلی ہوئی نازنین تھی۔ گو اُس کے حرم میں مختلف ممالک کی تین سو عورتیں تھیں، مگر وہ اُن کی نسبت اُس لڑکی

سے ایک وارفتگی کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ اُس کے حرم کی ہر ایک عورت بہار کے نکھرے ہوئے پھول کی طرح خوبصورت تھی۔ خان اُن کے لئے بڑی بڑی دور سے بھنا ہوا گوشت اور مٹھائیاں منگواتا اور

وہ اکثر اپنی منظور نظر کوسک لڑکی کو بُرج میں بلوایا کرتا، جہاں سے سمندر کا نظارہ ہو سکتا تھا۔ اسجگہ وہ اس کے لئے ایسے تمام سامان مہیا کرتا تھا۔ جو ایک عورت کی زندگی کو مسرور بنا سکتے ہیں۔ مختلف النوع مٹھائیاں، رنگ برنگ کے ریشمی کپڑے، سونے کے زیور، ہر قسم کے جواہرات، موسیقی، دور دراز ملکوں سے منگوائے ہوئے نایاب پرندے ـــــ اور اسپر فریفتہ شدہ خان کی ولولہ خیز اور پُرجوش دلنوازیاں ـــــ غرضکہ اُس کی تفریح کے لئے ہر قسم کی چیز وجود تھی۔

اس بُرج میں خان دیگر سرگرمیوں سے علیحدہ ہو کر کئی کئی روز اپنی منظور نظر کے ساتھ مشغول عیش رہتا۔ وہ اس خیال سے مطمئن تھا کہ اس کا بیٹا اُس کی اُس مانے کی حاصل کی ہوئی عظمت و شہرت کو برقرار رکھے گا۔ جب وہ روس کے ڈھلوانوں پر بھوکے بھیڑیئے کی طرح چھاپے مارا کرتا تھا۔ اور جب کہ وہ ہر چھاپے کے بعد بیشمار غنیمت کے بیش بہا مال و دولت، نئی عورتوں، اور نئی شان سے، اپنے پیچھے خون جلی ہوئی راکھ، اور ہیبت کے نشانات چھوڑ کر ظفر مندانہ واپس لوٹا کرتا تھا۔

• •

ایک دفعہ جب خان کا بیٹا الگالا روس میں چھاپہ مارنے کے بعد واپس آیا تو اُس کے اعزاز میں بڑے جشن منعقد کیے گئے۔ اُس جزیرے کے تمام مرزا اور سب بیگ اس تقریب میں شریک ہوئے۔ قسم قسم کی کھیلیں کی گئیں طرح طرح کی دعوتیں اڑائی گئیں۔ تیر اندازوں نے قیدیوں کی آنکھوں میں تیر گاڑ کر اپنے بازوؤں کی قوت کا مظاہرہ کیا۔ پھر الگالا کی صحت کے جام پی کر اُس کی شجاعت کے گیت گائے گئے۔ اور اس کے حریفوں کی ہیبت کا تذکرہ کیا گیا۔

اپنے بیٹے کی شجاعت کا ذکر سُن کر بوڑھے خان کو بہت خوشی حاصل ہوئی کیونکہ اب اس کی موت کے بعد اُس کی حاصل کردہ عظمت مضبوط ہاتھوں کے سپرد ہونے والی تھی۔ وہ بہت مسرور تھا۔ چنانچہ اُس نے اپنے لڑکے سے اپنی محبت کی پختگی ظاہر کرنے کے لئے اُس سے تمام مرزاؤں اور بیگوں کے سامنے جام ہاتھ میں لے کر کہا "میرے پیارے لڑکے! ـــ خدا بزرگ و برتر ہے اور اُس کا رسول باعظمت ہے۔"

یہ سُن کر تمام لوگوں نے بلند آواز میں ہم آہنگ ہو کر خدا اور اس کے رسول کی حمد گائی۔ خان پھر گویا ہوا:۔

"خدا بزرگ و برتر ہے! ـــ یہ اُس کی عنایت ہے کہ میری زندگی میں اُس نے میرا شباب میرے لڑکے میں زندہ کر دیا ہے۔ میں اپنی ان نحیف آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ جب سورج کی شعاعیں اُن سے اوجھل ہو جائیں گی۔ اور زمین میں

مدفون میرے دل کو کیڑے چاٹ رہے ہوں گے، تو میں اپنے لڑکے کے قالب میں منتقل ہو کر نئے سرے سے زندگی بسر کروں گا۔ خدا بڑا ہے اور محمدؐ اس کا سچا رسول ہے! ۔۔۔ میرا لڑکا میری خواہش کے مطابق ہے۔ اس کے بازو مضبوط اور قوی ہیں۔ اس کا دل جوان ہے، اسکا ضمیر صاف ہے ۔۔۔ تویک میرے لڑکے، بول جس چیز کی تو خواہش کرے گا وہ تجھے فوراً مل جائے گی!"

بوڑھے خان کی آواز کی گونج ابھی ختم ہونے ہی پائی تھی کہ تویک الگالا اٹھا۔ اس کی آنکھیں سمندر کے نیم شبی نظارے کی طرح سیاہ اور پہاڑوں کی چوٹیوں میں پلے ہوئے شاہین کی آنکھوں کی مانند شعلہ بار تھیں۔

"اے بادشاہ اور باپ، مجھے وہ رومی لڑکی دے دے!" اُسنے کہا

خان ایک لحظے کے لئے جو اُس کے دل پر طاری شدہ لرزے کو دبانے کے لئے ضروری تھا، خاموش رہنے کے بعد بلند اور مضبوط آواز میں بولا "جا اُسے لیجا ۔۔۔ دعوت ختم ہونے پر تو اُسکا مالک ہے۔"

خط لیپنہ، تویک الگالا کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ ہو گیا، اس کی شہابی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اپنے قد کو پوری لمبائی تک بلند کرتے ہوئے اس نے اپنے باپ سے کہا "اے باپ! مجھے معلوم ہے کہ تو مجھے کیا دے رہا ہے ۔۔۔ مجھے معلوم ہے میں تیرا غلام ہوں ۔۔۔ میری رگوں میں خون کا ہر قطرہ تیری خاطر بہنے کے لئے تیار ہے ۔۔۔ اگر میری بیس زندگیاں ہوتیں تو

میں بس ہی دفع خود کو تجھ پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوں!"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" یہ کہتے ہوئے خان کا سپید بالوں والا سر جسے بڑے بڑے شجاعانہ کارناموں اور کئی سالوں کی جمع شدہ حشمتوں نے بڑا وقار بخشا تھا۔ اُس کی چھاتی پر جھک گیا۔

جشن ختم ہونے پر باپ، بیٹا محل سے نکل کر حرم کی طرف روانہ ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں بڑی خاموشی سے چل رہے تھے۔

رات اندھیری تھی، چاند اور ستارے نظر آ رہے تھے۔ بادلوں نے آسمان پر موٹی چادر سی ڈال رکھی تھی۔

ایک عرصے تک وہ خاموش چلتے رہے۔ آخر کار خان نے مہرِ سکوت کو توڑا اور اپنے لڑکے سے کہا۔

"روز بروز میری زندگی ختم ہو رہی ہے ـــــ میرے بوڑھے دل کی دھڑکن اب رفتہ رفتہ کم ہوتی جاتی ہے۔ میرے سینے میں اب وہ پہلی سی آگ نہیں سلگتی میری زندگی کی روشنی اور حرارت اس کوسک لڑکی کی جوشیلی محبت تھی۔ تو لیک مجھے بتاؤ، مجھے بتاؤ، کیا یہ لڑکی واقعی تمہارے لئے اشد ضروری ہے؟ ـــــ میری بیویوں میں سے ایک سو لے لو ـــــ سب لے لو، مگر اس کو میرے پاس رہنے دو!"

اُس کا بیٹا آہ بھر کر خاموش رہا۔

"میری زندگی کے اور کتنے دن باقی ہیں؟ ـــــ مجھے صرف چند گھڑیاں اس زمین پر اور زندہ رہنا ہے۔ یہ روسی لڑکی میری زندگی کی واحد اور آخری خوشی ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح سمجھتی ہے، محبت کرتی ہے ـــــ اگر وہ میرے پاس نہ ہوئی تو پھر مجھ، بوڑھے سے اور کون محبت کرے گا؟ ـــــ کون ہے جو محبت کرے گا؟ ـــــ ان میں ایسی کوئی بھی نہیں، ایک بھی نہیں، میرے پیارے بچے!"

تولیک نے کچھ نہ کہا۔

میں یہ جانتے ہوئے کیونکر زندہ رہ سکوں گا، کہ تم اس کو اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے ہو اور وہ تمہیں چوم رہی ہے! ـــــ

ایک عورت کے معاملے میں ہم یقیناً باپ اور بیٹا نہیں ہیں۔ ہم صرف مرد ہیں اور بس! ـــــ آہ، کاش کہ میرے جسم کے تمام زخموں کے منہ کھل جائیں اور اُن سے میرے خون کا آخری قطرہ بھی بہہ جائے ـــــ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں یہ سب کچھ دیکھنے اور سہنے سے پہلے ہی مر گیا ہوتا!!"

اُس کا بیٹا خاموش رہا۔ حتیٰ کہ وہ حرم سرائے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ یہاں وہ دونوں خاموشی میں ایک عرصے تک اپنے سر لٹکائے کھڑے رہے۔ اُن کے گرد و پیش تاریکی ہی تاریکی تھی۔ آسمان پر بادل ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ ہوا درختوں کی جھولا جھلا رہی تھی، گویا وہ اُن کو لوریاں دے رہی ہے۔

"ابّا، میں ایک عرصے سے اُس کی محبت میں گرفتار ہوں" تولیک الگالا لے اپنے باپ سے کہا۔ "یہ مجھے معلوم ہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ تجھ پہ التفات نہیں کرتی" خان نے جواب دیا۔

"مگر میرا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے، جب میں اُس کا خیال کرتا ہوں"

"جانتے ہو میرا نحیف دل اسوقت کس جذبے سے معمور ہے؟"

وہ کچھ عرصے کے لئے پھر خاموش ہو گئے۔ تولیک نے آہ بھری اور کہا۔ عقلمند ملّاں نے ٹھیک کہا تھا۔ عورت ہمیشہ مرد کی تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ اگر وہ حسین ہے، تو اُس کا حسن دوسرے لوگوں کے دلوں میں اُس کو اپنا بنا لینے کی ترغیب پیدا کرتا ہے۔ اس طرح اس کا خاوند رشک وحسد کی آگ میں جلتا ہے۔ اگر وہ بدشکل ہے، تو اُس کا شوہر دوسروں پر حسد کھاتا ہے۔ اگر وہ نہ حسین ہے اور نہ بدشکل تو مرد اُس کو خوبصورت تصور کرتا ہے۔ لیکن فوراً ہی محسوس کرتے ہوئے کہ اُس کا یہ اندازہ غلط ہے۔ وہ مغموم ہو جاتا ہے ——— یعنی ایک بار پھر یہی عورت اُس کی اذیت کا باعث ہوتی ہے!"

"میرے بچے، دانشمندی دل کے درد کی دوا نہیں ہے!" خان نے جواب دیا۔

"تو پھر آؤ، ہم اُس کو قتل کر دیں"

یہ سُن کر خان نے اپنا سر اونچا کیا۔ اور غمگین آنکھوں سے اپنے لڑکے کی

طرف دیکھا۔

"ہم اُس کو کیوں نہ قتل ہی کر دیں" تو لیک نے اپنے الفاظ دہرائے۔

خان نے ایک لحظے کیلئے غور کیا، پھر گنگناتے ہوئے کہا۔

"تو اُس کی اور میری نسبت خود سے زیادہ پیار رکھتا ہے!"

"یہ درست ہے، مگر اے باپ، تو بھی ایسا ہی کرتا ہے۔"

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

"واقعی میں خود سے زیادہ پیار رکھتا ہوں!" خان نے غمگین لہجے میں کہا۔ غم نے اُسے بچہ بنا دیا تھا۔

"تو کیا یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ وہ قتل کر دی جائے گی؟"

"میں وہ لڑکی تمہیں نہیں دے سکتا — آہ! نہیں دے سکتا!"

"اور میں زیادہ تر فرقت برداشت نہیں کر سکتا۔ یا وہ مجھے دے دو یا پھر میرے دل کو چیر کر باہر نکال پھینکو!"

خان چپ رہا

"ہمیں چٹانوں پر سے اُسے سمندر میں دھکیل دینا چاہیئے"

"ہمیں چٹانوں پر اُسے سمندر میں دھکیل دینا چاہیئے" خان نے اپنے بیٹے کے لفظ غیر ارادی طور پر دہرائے۔ گویا وہ اُن کی ایک گونج تھے۔

یہ گفتگو کرنے کے بعد وہ دونوں حرم سرائے میں گئے۔ یہاں وہ کوسک لڑکی

اپنے پر تکلف قالین پر محوِ خواب تھی۔

وہ دونوں بڑھے اور دیر تک خوابیدہ حُسن پر نگاہیں جمائے کھڑے رہے خان کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے جو اس کی سپید داڑھی پر گر کر موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اُس کا بیٹا شعلہ نما آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہُوئے اپنے شباب کے مچلتے ہُوئے جوش کو دانت پیسنے کے عمل سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا ـــــ وہ جاگی، اُس کے نرم و نازک چہرے پر، جو طلوعِ آفتاب کے منظر کی طرح دلکش تھا، اُس کی آنکھیں پھُول کی طرح کھلیں۔ اُسنے تولیک کو نہ دیکھا۔ اور اپنے لعلیں ہونٹ، خان کی طرف بڑھا دیئے۔

"میرے شاہیں، اِن کو چُومو!"

"اُٹھو، پیاری، اور ہمارے ساتھ چلو!" خان نے آہستگی کے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر اُس نے تولیک کی طرف دیکھا، پھر فوراً خان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کا مطلب اُسپر واضح ہوگیا اور وہ سب معاملہ سمجھ گئی۔

"میں چلنے کو تیار ہوں" اُس نے اپنی نقرئی آواز میں کہا "میں تیار ہوں۔ ـــــ کیا یہی فیصلہ ہُوا ہے۔ تاکہ نہ میں تمہاری ہوں گی اور نہ اسکی؟ ـــــ آہ اس فیصلے کے لئے کسقدر مضبوط دلوں کی ضرورت تھی ـــــ میں تیار ہُوں، چلو!"

لڑکی نازک جسم تھی۔ تھوڑی دور چل کر وہ تھک گئی، مگر یہ تھکاوٹ اُس کیلئے باعثِ فخر تھی اور وہ اسے ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی۔

جب خان کے لڑکے نے دیکھا کہ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ تو اُس نے اُس سے کہا "کیا تم خائف ہو؟"

یہ سُن کر اُس کے دل پر چوٹ لگی، اُس کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور اُس نے مجبوراً اپنے زخمی پیر دکھا دیئے۔

آؤ، میں تم کو اُٹھا لوں" یہ کہتے ہوئے تولیک نے لڑکی کی طرف اپنے بازو پھیلائے مگر اُس نے بہلو بدل کر اپنی باہیں اپنے بوڑھے شاہین کی گردن میں حائل کر دیں۔ خان نے اُسے پر کی طرح اُٹھا لیا اور چلنے لگا۔ وہ اس کے بازوؤں میں لپٹی ہوئی درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں کو ہاتھ سے ہٹاتی جاتی تھی۔ کہ کہیں وہ اُس کے محبوب کی آنکھوں کو زخمی نہ کر دیں۔ وہ ایک عرصے تک چلتے رہے۔ آخر کار سمندر کی لہروں کی دھیمی آواز آنے لگی۔ اسوقت تولیک جو اُنکے پیچھے آرہا تھا۔ آگے بڑھا اور اپنے باپ سے کہا۔

مجھے آگے چلنے دو۔ ورنہ میری خواہش ہوگی کہ تیری گردن، میں اپنا خنجر گھونپ دوں!"

"چلو، آگے بڑھ جاؤ ــــ تیری خواہش کا پورا ہونا یا نہ ہونا اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ تجھے معاف کرے ــ میں تجھے معاف کرتا ہوں اس لئے

کہ مجھے معلوم ہے محبت کرنا کسے کہتے ہیں!"

آخر کار سمندر اُن کے سامنے تھے۔ چٹان جس پر کہ وہ کھڑے تھے اُس کے نیچے، بہت دور گہرائیاں تھیں، اتھاہ اور تاریک! لہریں، نیچے، چٹانوں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر دھیما راگ الاپ رہی تھیں ـــــ نیچے، جہاں غضب کی تاریکی خوف اور سردی تھی۔

خان نے اپنی محبوبہ کو آخری بار چوما اور کہا" پیاری الوداع!"

"الوداع" تولیک نے جھک کر کہا۔

لڑکی نے نیچے کی طرف دیکھا، جہاں موجیں گا رہی تھیں۔ اور خوف کے مارے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیچھے کو ہٹ گئی

"مجھے نیچے گرا دو" اُس نے باپ بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا

بیٹے نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھائے اور کچھ بڑبڑایا مگر خان نے آگے بڑھ کر اُس کو اپنی چھاتی کے ساتھ زور سے بھینچا اور اُس کے لبوں کے بوسے لیکر اُسے ہاتھوں پر اٹھا کر چٹان پر سے نیچے سمندر میں گرا دیا۔

نیچے موجیں پتھروں کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر گا رہی تھیں۔ اُن کا شور اس قدر بلند تھا کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کب پانی کی سطح پر گری، کسی قسم کی آواز یا چیخ اُن کے کانوں تک نہ پہونچی

خان چٹان پر انتہائی غم کی حالت میں بیٹھ گیا اور خاموشی سے نیچے گہرائیوں

میں دیکھنا شروع کر دیا۔ دھندلے بالوں میں ملفوف تھا اور لہروں کے تھپیڑوں کی آواز گونج رہی تھی، ہوا تیزی سے گذرتی ہوئی اُس کی سپید داڑھی کے بالوں کو منتشر کر رہی تھی۔ تولیک اُس کے قریب خاموش، بے جان مجسمے کی طرح ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے کھڑا تھا۔ وقت گذرتا گیا، رفتہ رفتہ آسمان پر بادل چھاتے گئے، بادل کے یہ ٹکڑے بوڑھے خان کے خیالات کی طرح تاریک اور وزنی تھے، جو چٹان کی چوٹی پر خاموش بیٹھا تھا۔

"ابّا، آؤ چلیں!"

"ذرا ٹھیرو!" خان نے بڑی دھیمی آواز میں کہا جیسے کہ وہ کچھ سن رہا ہے۔ اسطرح اور وقت گذر گیا۔ لہریں نیچے پتھروں کے ساتھ ٹکراتی رہیں اور ہوا چٹانوں اور درختوں پر سے گذرتی ہوئی چلاتی رہی۔

"ابّا، آؤ چلیں!"

"ابھی ذرا ٹھیرو!"

تولیک الگالا نے بہت مرتبہ اپنے باپ سے جانے کو کہا مگر وہ اُس جگہ سے اُٹھ کر جانا نہ چاہتا تھا، جہاں اُس نے اپنے آخری ایام کی واحد مسرت کو کھو دیا تھا۔

مگر ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے؟ — آخر کار وہ اُٹھا۔ اب اُس کے چہرے سے عزم و فخر کے آثار مترشح تھے۔ اُس نے کھوکھلی آواز میں اپنے لڑکے سے کہا

"چلو آؤ"

اُنہوں نے گھر کا رُخ کیا مگر چند قدموں کے فاصلے پر ہی خان ٹھہر گیا۔

"مگر میں کیوں جا رہا ہوں ـــ کدھر جا رہا ہوں؟" اُس نے اپنے لڑکے سے پُوچھا "میں اب کیوں زندہ رہوں، جب میری زندگی اُس کی ذات سے وابستہ تھی؟ ـــ میں عمر رسیدہ ہوں، مجھ سے کوئی محبت نہ کرے گا ـــ اور جب کوئی محبت کرنے والا نہ ہو تو زندہ رہنا احمقانہ فعل ہے!"

"ابّا تیرے پاس دولت و ثروت ہے!"

"مجھے اُس کے لبوں کا صرف ایک بوسہ دے دو اور یہ دولت و ثروت تم لے سکتے ہو۔ یہ چیزیں سب مُردہ ہو چکی ہیں، صرف عورت کی محبت ہی زندہ رہتی ہے۔ اگر کسی مرد کی زندگی عورت کی محبت سے خالی ہے، تو وہ زندگی ہی نہیں ـــ وہ مرد ایک فقیر ہے اور رحم کے قابل ہے۔ الوداع، میرے لڑکے! خدا کی عنایات ہمیشہ تیرے شاملِ حال رہیں"

یہ کہتے ہوئے خان چٹان کی طرح واپس مُڑا۔

"ابّا، ابّا!" تو لیک چلّاتا رہا مگر وہ اپنے باپ کو نہ روک سکا ـــ وہ شخص کچھ نہ سُنے گا جسے موت مُسکرا رہی ہو۔ اس کے علاوہ زندگی کی گم کردہ مسرت کو کون سے لفظ واپس لا سکتے ہیں۔

"مجھے جانے دو!"

"میرے اللہ!"

"وہ سب کچھ جانتا ہے ....."

تیز قدم اُٹھاتے ہوئے خان چٹان کے کنارے پر پہنچا اور نیچے کود پڑا اُسکا بیٹا اُس کو روک نہ سکا کیوں کہ سب کچھ ایک لمحے ہی میں ہوگیا۔ اب کی بار پھر سمندر میں سے کسی قسم کی آواز نہ آئی ـــــ صرف لہروں کے تھپیڑوں کی آواز اور ہوا کے جنگلی گیتوں کی صدا آرہی تھی۔

تولیک الگالا۔ ایک عرصے تک نیچے کیطرف دیکھتا رہا۔ آخرش اُس نے بلند آواز میں کہا!

اے اللہ مجھے بھی ایسا ہی مضبوط دل عطا کر!"

یہ کہہ کر وہ رات کی تاریکی میں چلا گیا .....

یہ ہے جسطرح خان مرا اور اُس کے بعد تولیک الگالا جانشین ہوا۔

خزاں کی ایک رات

موسم خزاں کی ایک رات کا ذکر ہے، میں عجیب بے اطمینانی اور بے چینی کی حالت میں تھا۔ جس قصبے میں میں ابھی ابھی وارد ہوا تھا اور جہاں میں کسی متنفس سے بھی واقف نہ تھا، میں نے اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ میری جیب میں ایک پائی نہ تھی اور رات بھر کا بسیرا میسّر نہ تھا۔

پہلے چند روز میں میں نے اپنے لباس کا ہر وہ حصہ بیچ کھایا جس کے بغیر میں ادھر اُدھر جا آسکتا تھا۔ پھر شہر کو چھوڑ کر اس حصّے میں چلا آیا جہاں دخانی جہازوں کے لنگر ڈالے ٹھہرے ہیں۔ —— وہ حصّہ جو جہاز رانی کے زمانے میں زندگی کی جدوجہد کا مرکز بنا رہتا ہے۔ لیکن جواب خاموش اور سنسان تھا۔ کیونکہ یہ ماہ اکتوبر کے آخری دن تھے۔

گیلی گیلی ریت پر اپنے پاؤں کو گھسیٹتے ہوئے کہ شاید اس میں کسی قسم کی خوراک کا کوئی ٹکڑا دبا ہوا ہو، میں تن تنہا خالی مکانوں اور گوداموں میں گھوم رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں یہ خیال کر رہا تھا۔ کہ کیا اچھا ہو اگر پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔

موجودہ تہذیب و تمدّن کو دیکھ کر ہمارا دل سیر ہو جاتا ہے۔ لیکن ہمارا جسم بھوکا ہی رہتا ہے بازاروں میں جاؤ، وہاں عالی شان عمارتوں میں گھر جاؤ گے۔ اور اُن کا نظارہ فنِ تعمیر، ترقّیٔ معاشرت اور ایسے ہی بلند پروازی کے دوسرے موضوعات پر تمہارے خیالات کے لئے تقویت بخش ثابت ہو گا۔ تم کو عمدہ عمدہ گرم لباسوں میں لپٹے ہوئے لوگ ملیں گے ـــــ بڑے نرمی سے بات کرنے والے بڑی حکمت سے کنی کتر کے نکل جانے والے، تمہارے ننگِ زمانہ وجود سے نامعلوم طریقے پر نظریں پھیر لینے والے ـــــ ہاں، ہاں۔ ایک بھوکے آدمی کا دل ہمیشہ اُس شخص سے زیادہ تندرست اور توانا ہوتا ہے۔ جسے پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا ہو اور عسرت ہی وہ صورتِ حال ہے، جس میں ہمیں اُن لوگوں کی بہبود کا خیال آتا ہے، جن کا وقت فاقہ مستی میں کٹتا ہے۔

شام کا سایہ بڑھتا چلا آتا تھا۔ مینہ برس رہا تھا۔ اور شمال کی تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ خالی بیٹھکوں اور دوکانوں میں اُس کے گزرنے سے چیخوں کی سی آواز پیدا ہوتی تھی، اور دریا کی لہریں جو شور مچاتی ہوئی ریتیلے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں

اُس کے طمانچوں سے کف آلودہ ہو جاتی تھیں۔ اچھل اچھل کر گرتی پڑتی، ایک کے پیچھے ایک ہو کر دُھندلی دُوریوں کی طرف بھاگی جاتی تھیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دریا جاڑے کی شکل دیکھتے ہی بے تحاشا بھاگ رہا ہے۔ کہ کہیں شمال کی برفانی ہوا اپنی بیڑیاں آج ہی رات اُس کے پاؤں میں نہ ڈال دے۔ آسمان بوجھل اور تاریک ہو رہا تھا اور اُسپر سے مینہ کے باریک باریک قطرے لگاتار گر رہے تھے۔ نیچر کا غم انگیز ماتمی گیت بید مجنوں کے دو بدشکل درختوں اور ایک اوندھی پڑی ہوئی اور ان درختوں سے بندھی ہوئی کشتی کی موجودگی سے اور بھی مؤثر ہو گیا تھا۔

اُلٹی ہوئی کشتی کا پیندا ٹوٹا ہوا تھا اور خراب وخستہ بوڑھے درخت جنکے برگ وساز سرد ہوا لوٹ لے گئی تھی، بلکہ ہر وہ چیز جو میرے ارد گرد پھیلی تھی مفلوک الحال، ابتر اور بے جان نظر آتی تھی اور اس نظارے کو دیکھ دیکھ کر آسمان کے آنسو نہ تھمتے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر چیز تیرہ وتار ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز مر چکی ہے۔ اور صرف میں اکیلا زندہ رہ گیا ہوں اور میرے لئے بھی موت کا یہ زہر یہ انتظار کر رہا ہے۔

اُس وقت میری عمر اٹھارہ برس کی تھی۔۔۔۔۔ کیا ہی زمانہ تھا؟

میں سرد گیلی ریت پر بہت دور تک چلا گیا۔ سردی اور بھوک کے اعزاز میں میرے دانت ایک ساز کی طرح بج رہے تھے۔ ایک جگہ خالی الماریوں کے

نیچے میں کوئی کھانے کی چیز تلاش کر رہا تھا کہ یکایک میری نظر ایک انسانی صورت پر پڑی۔ اُس کا نسوانی لباس بارش کی وجہ سے تر بہ تر ہو کر اُس کے جھکے ہوئے کندھوں سے پیوست ہو گیا تھا۔ میں چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا کہ وہ کیا کرتی ہے، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے ریت میں کوئی خندق ہی کھود رہی ہے۔

"تم یہ کیا کر رہی ہو؟" میں نے اُس کے قریب جا کر کہا۔

ایک ہلکی سی چیخ اُس کے منہ سے نکلی اور وہ کھڑی ہو گئی۔ ایسا کہ وہ خوف سے بھری ہوئی بڑی بڑی نیلی نیلی آنکھیں کھولے میرے سامنے کھڑی تھی میں نے دیکھا کہ وہ لڑکی ہے، میری ہی عمر کی، جس کے روشن چہرے کو تین بڑے بڑے نیلے داغوں نے گہنا رکھا ہے۔ گو ان داغوں کی تقسیم اُس کے چہرے پر نہایت موزونیت اور تناسب کے ساتھ ہوئی تھی۔ پھر بھی اُنہوں نے اُس کے حسن کو چھپا دیا تھا۔ تینوں اپنی اپنی جگہ اکیلے اکیلے نمایاں تھے۔ سب جسامت میں تقریباً برابر تھے ـــــ دو آنکھوں کے نیچے اور ایک جو بڑا تھا پیشانی پر ناک کے عین اوپر بلاشبہ یہ کام تھا کسی اُس حسن کار کا جو انسانی صورتوں کو بگاڑنے کا شوق رکھتا ہو۔

وہ میری طرف دیکھتی رہی اور اُس کی آنکھوں میں سے دہشت آہستہ آہستہ مفقود ہوتی گئی ..... اُس نے ہاتھوں پر سے ریت جھاڑی، سر کے سنہری رومال کو ترتیب سے باندھا، پھر ذرا جھکی اور کہا:-

"میں سمجھتی ہوں کہ تمہیں بھی کھانے کے لئے کچھ چاہیئے، تو پھر اس جگہ کو کھودو۔ میرے ہاتھ تھک گئے ہیں ـــ یہاں!" ـــ اُس نے اپنے سر کی جنبش سے ایک دوکان کی طرف اشارہ کیا ـــ "یہاں روٹی کا مل جانا یقینی ہے ..... اور سالن کا بھی ..... یہ دوکان ان دنوں بھی کھلی ہے"

میں زمین کھودنے لگا۔ کچھ دیر ٹھیر کر اور میری طرف دیکھنے کے بعد وہ میرے قریب بیٹھ گئی اور مجھے مدد دینے لگی۔

ہم خاموشی کے ساتھ کام کرتے رہے، میں اب نہیں کہہ سکتا کہ اُس وقت جُرم، قانون، ملکیت اور ایسی ہی وہ تمام باتیں جن کے متعلق تجربہ کاروں کی رائے ہے کہ زندگی کے ہر لمحے میں ملحوظ رہنی چاہئیں میرے خیال میں تھیں یا نہیں صداقت کے انتہائی قریب رہتے ہوئے میں اقرار کرتا ہوں کہ میں کھودنے میں اتنا منہمک تھا کہ اس ایک بات کے سوا کوئی دوسری بات میرے وہم و خیال میں بھی نہ آتی تھی کہ اس الماری کے اندر کیا ہوگا!

شام کا سایہ پھیلتا گیا، چاروں طرف کہر کی تاریکی بڑھتی گئی، موجوں کا شور بھاری ہوتا گیا اور مینہ کے چھینٹے الماری کے تختوں پر پہلے سے بلند آواز کے ساتھ گرنے لگے کبھی ادھر کبھی اُدھر سے پہرہ داروں کی آوازیں آنے لگیں۔

"اس کا کوئی پتہ بھی ہے؟" اُس نے آہستہ سے پوچھا۔ میں نہ سمجھ سکا

کہ اُس نے کیا کہا۔ اس لئے میں خاموش رہا۔

"میں کہتی ہوں، اس الماری کی کوئی تہہ بھی ہے؟ ــــ کہیں یہ نہ ہو کہ ہم کھود تے کھود تے ایک خندق بنا دیں اور یہ نتیجہ ہو کہ الماری کے نیچے بھی لکڑی کے مضبوط تختے لگے ہوں، ایسی صورت میں ہم کیوں کر اُنہیں اکھاڑ سکیں گے؟ بہتر ہو کہ تالے توڑ ڈالیں ــــ اس ناکارہ تالے کو"

عورتوں کو عمدہ خیالات شاذ و نادر ہی سوجھتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی سوجھ جاتے ہیں۔ میں نے عمدہ خیالات کی ہمیشہ قدر کی ہے۔ اور ہمیشہ جہاں تک ممکن ہو سکا اُن سے مستفید ہونے کی کوشش کی ہے۔

میں نے تالے کو پکڑ کر اس زور سے مروڑا کہ وہ کنڈی سمیت اکھڑ آیا۔ وہ جھپٹ کر آگے بڑھی اور الماری کا جائزہ لیتی ہوئی مجھ سے یوں کہنے لگی۔

"تم تو لوہا ہو، لوہا!"

آج کسی عورت کا ایک چھوٹا سا تعریفی فقرہ میرے لئے اُس مرد کے بڑے سے بڑے قصیدے سے زیادہ قدر و قیمت رکھتا ہے، جس میں تمام قدیم اور جدید لسانیات جمع ہوں، لیکن اُس وقت میرے مزاج میں اکھڑپن تھا اور اب اُس کی اصلاح ہو چکی ہے، چنانچہ اُس کی تحسین و تعریف پر کان نہ دھرتے ہوئے، میں نے بے تابانہ اُس سے سوال کیا۔

"اس میں کچھ ہے بھی؟"

وہ ایک بے کیف آواز کے ساتھ سب چیزوں کو گننے لگی۔

"ٹوکری بھر بوتلیں ـــــ پوستینیں ـــــ ایک چھتری ـــــ لوہے کی ایک گڑوی"

ان میں کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، میری تمام اُمیدیں مٹ گئیں ـــــ لیکن یکایک وہ شگفتہ خاطر ہو کر بولیں۔

"آہا، یہ لو!"

"کیا؟"

"روٹی ..... ایک روٹی ..... صرف بھیگ رہی ہے ..... یہ لو!"

اُس نے اُسے میری طرف پھینک دیا اور پھر خود بھی چلی آئی، اُس کے آنے تک میں نے ایک بڑا سا لقمہ دانتوں سے توڑ کر اپنا منہ بھر لیا تھا۔ اور اب اُسے چبا رہا تھا .....

"آؤ، اس میں سے تھوڑی سی مجھے بھی دے دو .... اور ہمیں یہاں ٹھیرنا نہیں چاہیئے ..... لیکن ہم کہاں جائیں" وہ ہر طرف متفسرانہ نظروں سے دیکھنے لگی .... فضا میں تاریکی، نمی اور شور تھا۔

"دیکھو، وہ ایک اُلٹی ہوئی کشتی پڑی ہے ..... آؤ، وہاں چلیں"

"چلو"

اور ہم چل پڑے ..... اپنے مالِ غنیمت کے حصے بخرے کرتے ہوئے

اور اس کے بڑے ٹکڑوں سے اپنے کلوں کو بھرتے ہوئے ..... بارش اور تیز ہو گئی، دریا رعد کی طرح گرجنے لگا۔ کہیں، نہ کہیں ایک مسلسل مضمحل اڑانے والی سیٹی بج رہی تھی ..... بالکل اس طرح جیسے کوئی بالا و برتر ہستی جسے کائنات میں کسی کا خوف نہ ہو ــــ تمام زمینی سرگرمیوں کی، خزاں کی، اس ہیبتناک رات کی اور ہماری جو اس طوفانی رات کے ہیرو ہیں ہنسی اڑا رہی ہے۔ اس ہنسی کو سن کر میرا دل پارہ پارہ ہو گیا۔ مگر اس کے باوجود اپنی روٹی حریصانہ کھاتا رہا۔ اور یہ لڑکی جو میرے بائیں جانب ساتھ ساتھ چل رہی تھی مگر اس معاملے میں بھی میرے قدم بہ قدم جا رہی تھی۔

میں نے ابھی تک اُس کا نام دریافت نہ کیا تھا۔ اب میں نے کہا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نتاشا" اُس نے جھٹ جواب دیا۔

میں نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی اور پھر میں نے اپنی نظریں رات کی تاریکی کی طرف پھیر لیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری قسمت کی بدانداز صورت میری طرف دیکھ دیکھ کر عجب پُراسرار اور بے رحمانہ انداز سے مسکرا رہی ہے۔

مینہ کشتی کے تختوں پر تازیانوں کی طرح مسلسل پڑ رہا تھا۔ اُس کی ہلکی ٹپ ٹپ غم و الم کے خیالات برانگیختہ کر رہی تھی، اور ہوا جب کشتی کی ایک

درزوں سے اُس کے ٹوٹے ہوئے پیندے میں داخل ہوتی تھی۔ تو اس میں سے ایک عجیب اضطراب انگیز اور اُداس آواز اُٹھتی تھی۔ دریا کی لہریں آ آ کر ساحل سے ٹکراتی تھیں تو ان میں سے ایک بھیانک اور مایوس کن صدا پیدا ہوتی تھی، اس طرح جیسے وہ کوئی رنج دہ اور ناقابلِ برداشت کہانی سنا رہی ہیں، جو خود اُن کی ہمتوں کو توڑ توڑ کر رکھ دیتی ہے ۔۔۔ ایسی کہانی جس کو سُنائے بغیر وہ بھاگ جانا چاہتی ہیں، لیکن جس کو سُنانے پر مجبور رہیں۔ بارش کی آواز دریا کی آواز سے مل کر ایک آہِ مسلسل بن جاتی تھی جو اوندھی کشتی کے اوپر تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی ۔۔۔ جفاکش، زخمی دل اور خستہ و ماندہ زمین کی وہ بے اختتام آہ جو تاباں و درخشاں بہاروں سے نکل کر سرد، کہر آلود اور تاریک خزاں کی منزل سے گزرتے وقت اُس کے سینے سے نکلتی تھی۔ ہوا سنسان اور کف انگیز دریا پر چل رہی تھی ۔۔۔ چل رہی تھی اور اپنے الم ناک راگ گائے چلی جاتی تھی۔

کشتی کی اوٹ میں ہم بالکل بے آرامی کی حالت میں پڑے تھے۔ یہ تنگ تھی اور بھیگ رہی تھی، ٹوٹے ہوئے پیندے میں سے بارش کے چھوٹے چھوٹے سرد قطرے ٹپکتے تھے اور ہوا کے سرد جھونکے اندر داخل ہوتے تھے۔ ہم خاموش بیٹھے تھے اور سردی سے کانپ رہے تھے۔ پھر مجھے نیند کا خیال آیا۔ نتاشا کشتی سے سہارا لگائے گٹھم گٹھا ہو کر ایک چھوٹی سی گیند بنی بیٹھی تھی۔ بانہوں کو گھٹنے

کے گرد لپیٹے اور ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے وہ اپنی کشادہ آنکھوں سے دریا کی طرف گھور رہی تھی، اُس کی آنکھیں اُس کے زرد چہرے پر نیلے داغوں کی وجہ سے اور بھی بڑی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ بالکل بے حرکت ہو رہی تھی۔ اور میں محسوس کرنے لگا کہ یہ سکون و سکوت میرے اندر رفتہ رفتہ اُسکی طرف سے خوف پیدا کر رہا ہے۔ میں اُس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا مگر کیوں کر شروع کروں۔

"زندگی کیسا دُکھ ہے!" اُس نے نہایت صفائی، محویت اور یقین کے لہجے میں کہا۔

لیکن یہ شکایت نہ تھی، ان الفاظ کو کچھ ایسی بے اعتنائی سے ادا کیا گیا تھا کہ ان میں شکایت کا شائبہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس سادہ اور بے لوث رُوح نے زندگی پر اپنی سمجھ کے مطابق غور کیا تھا ــــ غور کیا تھا اور ایک نتیجہ پر پہنچ کر اُسے بلند آہنگی سے بیان کر دیا تھا۔ میں اُس کی تردید نہ کر سکتا تھا کیونکہ اگر میں ایسا کرتا تو یہ میری اپنی تردید ہوتی۔ اس لئے میں خاموش رہا۔ اور وہ اسی طرح بے حرکت بیٹھی رہی۔

"کیا ہوگا ..... اگر ہم زندگی کو بُرا بھی کہدیں؟" تناشا نے پھر کہا۔

اس دفعہ بھی اُس کے لہجے میں شکایت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ زندگی کے متعلق ان خیالات کے اظہار کے وقت اُس کے پیشِ نظر اُسکی اپنی ذات تھی اور اُسے یقین ہو چکا تھا کہ اپنے آپ کو زندگی کی تضحیک

استہزا سے بچانے کے لئے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتی کہ اُس کی تحقیر کرے یہ سلسلۂ خیالات میرے لئے ناقابلِ بیان طور پر غم انگیز اور پُر درد تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اگر میں اب بھی خاموش رہا تو عجب نہیں کہ میں ظاہراطور پر رونے لگوں — اور ایک عورت کے سامنے یہ حرکت کیسی شرمناک معلوم ہوتی خصوصاً ایسی صورت میں کہ وہ خود رو نہ رہی تھی، میں اُس سے باتیں کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

"اور وہ کون تھا جس نے تمہیں پیٹا تھا؟" میں نے جھٹ کہہ دیا، کیوں کہ میں اس سے کسی زیادہ دقیق اور لطیف بات کے سوچنے کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔

"یہ سب پاشکا کی مہربانی تھی!" اس نے سادہ لوحی سے کہا

"وہ کون ہے؟"

"اُسے مجھ سے محبت ہے...... وہ نانبائی کا کام کرتا ہے۔"

"کیا وہ اکثر تمہیں مارتا ہے؟"

"جب کبھی وہ شراب کے نشے میں ہوتا ہے، وہ مجھے مارتا ہے ...... اکثر!"

اب یکایک اُس نے میری طرف مڑ کر اپنے متعلق، پاشکا کے متعلق اور اپنے باہمی تعلقات کی نسبت باتیں شروع کر دیں۔ کہ وہ ایک نانبائی تھا۔ اُس کی مونچھیں

سُرخ تھیں اور وہ ستار بہت اچھی بجاتا تھا۔ وہ اکثر اُس سے ملنے آتا تھا۔ اور اُسے اُس سے مل کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔ کیونکہ یہ خوش طبع چھوکرا عمدہ اور نفیس لباس پہنتا تھا۔ اُس کے پاس ایک واسکٹ تھی، جس پر اُس کے پندرہ روبل خرچ آئے تھے اور ایک بہت خوبصورت مخملی لوٹ بھی تھا ــــ یہ تھیں وہ تمام باتیں جنہوں نے اس سیدھی سادھی لڑکی کا دل موہ لیا تھا۔ اور اُس کی نظروں میں اعتبار پیدا کر لیا تھا۔ اسی اعتبار پر وہ اُس سے وہ تمام نقدی اڑا لے جاتا تھا جو اُسے گھر سے ملتی تھی، لیکن اُس کی وہ ذرہ برابر پرواہ نہ کرتی اگر وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے دوسری لڑکیوں کے پیچھے نہ بھاگتا پھرتا۔

"اب کیا یہ میری توہین نہ تھی؟ ــــ میں دوسری لڑکیوں میں صورت شکل میں تو کم نہیں، یقیناً اس کے یہی معنے تھے کہ وہ مجھ سے مذاق کرتا ہے، نابکار۔ کل کی بات ہے میں اپنی مالکہ سے تھوڑی دیر اجازت لے کر اُس کے پاس گئی اور وہاں میں نے دیکھا کہ دمکا شراب پی کر بدمست ہو رہی ہے اور پاشکا کی عقل بھی سمندر پار پہونچی ہے۔ میں نے کہا "او ذلیل کمینے!" ــــ اس پر اس نے مجھے خوب سزا دی۔ وہ مجھے لاتوں اور مکوں سے مارتا رہا اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا رہا۔ لیکن یہ سب اُس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ جو بعد میں ہوا۔ اُس نے میرا سارا لباس اتار لیا اور جب چھوڑا تو میں اس حالت میں تھی جو میری اب ہے! ــــ اب کیسے میں اپنی بیگم کے سامنے جا سکتی تھی؟ اُس نے میری

تمام چیزیں چھین لیں ..... میرا جاکٹ بھی لے لیا۔ یہ ابھی بالکل نیا تھا، ابھی چند روز ہوئے میں نے اسپر ایک پنجہ خرچ کیا تھا..... اُس نے میرے سر سے رومال بھی اُتار لیا ــــ اومیرے خُدا، میرا اب کیا انجام ہوگا" وہ یکایک ایک آزردہ اور دردمند آواز میں چلّا اُٹھی۔

ہوا چیخیں مارتے ہُوئے چلنے لگی۔ اور زیادہ سرد اور نم آلود ہوگئی..... میرے دانت پھر اچھل اچھل کر رقص کرنے لگے۔ وہ سردی سے بچنے کے لئے میری جانب چلی آئی اور میرے جسم سے لگ کر مجھ سے اتنی قریب ہوگئی کہ اندھیرے میں مجھے اُس کی آنکھوں کی چمک نظر آنے لگی۔

"کیسے کم بخت ہو تم تمام مرد! میرا بس چلے تو تم سب کو بھٹی میں ڈال کر جلا دوں، تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں، اگر تم میں سے کوئی مر رہا ہو تو اُس کے منہ میں تھوک دوں اور اس کی پیشتہ بھر بھی پروا نہ کروں ــــ کمینے کُتّے! تم خوشامدیں اور چاپلوسیاں کرتے ہو، کتّوں کی طرح دُمیں ہلا ہلا کر ہماری طرف آتے ہو اور ہم نادان اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی ہستی کو کھو بیٹھتی ہیں، پھر ذرا سی دیر بھی نہیں گذرتی کہ تم ہمیں اپنے پیروں تلے روندنا شروع کر دیتے ہو ــــ بدنصیبو، بدبختو!!"

وہ ہمیں بُرا بھلا کہہ رہی تھی لیکن اُس کے بُرا بھلا کہنے میں کوئی طاقت کوئی دشمنی، کوئی نفرت نہ تھی، اُس کی گفتگو کا لہجہ کسی طرح بھی اُس کے

موضوع کا ہم آہنگ نہ تھا، کیونکہ اُس میں کامل سکون تھا۔ اور اُس کی آواز خطرناک حد تک دھیمی تھی۔

مگر ان سب باتوں نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ قنوطیت کی وہ فصیح ترین کتابیں اور تقریریں بھی نہ کر سکیں، جن کا متعدد حصّہ میں پڑھ چکا تھا اور جنہیں آج تک میں پڑھ رہا تھا۔ اور یہ اس لئے کہ ایک مرتے ہوئے انسان کا درد و کرب اپنے اندر بہت زیادہ حقیقت اور قوّت رکھتا ہے۔ بہ نسبت موت کی اُس تصویر کے جسے کسی نے اپنے الفاظ کے باریک قلم سے کھینچ کر رکھ دیا ہو۔

میں اپنی حالت کو حقیقت میں ابتر محسوس کرنے لگا۔ نتاشا کی گفتگو سے متاثر ہو کر نہیں، بلکہ سردی کی شدت کی وجہ سے میں کراہنے لگا اور دانت پیسنے لگا۔

اُسی وقت دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ میری طرف بڑھے ـــــ ایک میری گردن کے گرد حمائل ہو گیا اور دوسرا میرے چہرے پر آ لگا ـــــ اور ساتھ ہی کسی نے فکرمند، نرم اور شیریں اور دوستانہ آواز میں پوچھا۔

"تمہیں کیا چیز دُکھ دے رہی ہے؟"

میں یہ یقین کر لینے پر تیار تھا کہ مجھ سے یہ سوال کرنے والا اُس نتاشا کے سوا کوئی دُوسرا بھی ہے، جس نے ابھی ابھی تمام مردوں کو بے حمیّت ظاہر کیا تھا اور اُن کو تباہ و برباد کر دینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لیکن یہ وہی تھی اور

اب وہ جلد جلد اور تیزی سے بولنے لگی تھی :-

"تمہیں کون سی چیز دکھ دے رہی ہے ؟ ـــ کیا تمہیں سردی لگ رہی ہے ؟ کیا تم ٹھٹھر رہے ہو ؟ ـــ آہ ! تم یوں ایک ننھے اُلو کی طرح بیٹھے ہوئے کیسے عجیب معلوم ہو رہے ہیں۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا، کہ تمہیں سردی ستا رہی ہے ـــ آؤ . . . . . . یہاں لیٹ جاؤ اور میں تمہارے ساتھ لیٹ جاؤں گی . . . ہاں یونہی، اب اپنی باہیں میرے گرد لپیٹ لو . . . . . کس کر ! اب بتاؤ ؟ اب تم بہت جلد گرم ہو جاؤ گے . . . . . . پھر ہم ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کر کے سو جائیں گے . . . . . . رات بہت جلد گذر جائے گی . . . . . . تم دیکھنا یہ کتنی جلد گذر جائے گی، میں کہتی ہوں . . . . . . کیا تم بھی شراب پیا کرتے تھے ؟ . . . . کیا تم سے بھی کام چھین لیا گیا ہے ؟ . . . . تم قطعاً پروا نہ کرو ؟"

اُس نے مجھے آرام پہنچایا . . . . . . میری ہمت بڑھائی

لعنت ہو، میری اس زندگی پر ! میری اس ایک مصیبت میں مہائی کی ایک دُنیا بستی تھی ! ذرا تصور کرو، میں، جو انسانیت کے انجام پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے میں مصروف رہتا تھا، نظامِ تمدن کو از سرِ نو ترتیب دینے کی تجویزیں سوچا کرتا تھا، سیاسی انقلابات کے خیالات اپنے دماغ میں بسایا کرتا تھا۔ اُن کتابوں کو پڑھا کرتا تھا، جنہیں شیطان صفت حکمت و فراست سے لکھا گیا تھا۔ اور جن کی انتہاء گہرائی تک خود مصنفین کا دماغ بھی نہ پہنچ سکا ہوگا۔

میں، جو اپنی تمام قوت سے کوشش کر رہا تھا کہ اپنے آپ کو ایک ذی اختیار عملی اشتراکی طاقت بناؤں، بلکہ یہ محسوس کر رہا تھا۔ کہ میں نے ایک حد تک اپنے مقصد کی تکمیل کر لی ہے، میں جو اپنے خیال میں اُس مقام تک پہنچ چکا تھا جہاں میں نے سمجھ رکھا تھا کہ مجھے زندہ رہنے کا ایک امتیازی حق حاصل ہے اور مجھ میں وہ عظمت موجود ہے جو اس حق کو ثابت کرتی ہے۔ اور میں دُنیا کے عظیم الشان تاریخی کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ کرنے کے بالکل قابل ہوں، یہاں پڑا تھا اور ایک عورت مجھے اپنے جسم کی حرارت سے گرما رہی تھی، ـــــ ایک مفلوک الحال، بے سروسامان، ستائی ہوئی ہستی، جس کی عرصۂ حیات میں کوئی قدر و قیمت نہ تھی اور جس کے مدد کرنے کا مجھے خیال تک نہ آیا تھا۔ یہاں تک کہ خود اُس نے خود میری مدد کی۔ اور اگر مجھے مدد کا خیال بھی آتا تو یقیناً میں یہ نہ جان سکتا کہ وہ کیونکر ہو سکتی ہے۔

میں یہ مان لینے پر تیار تھا۔ کہ یہ کوئی خواب ہے جو مجھ پر گذر رہا ہے ـــــ ایک ناخوشگوار اور اندوہگین خواب۔

لیکن آہ! میرے لئے یہ خیال کرنا ناممکن تھا۔ کیونکہ بارش کے سرد سرد قطرے مجھ پر پڑ رہے تھے، وہ مجھے سردی سے بچا رہی تھی، اور اُس کی گرم گرم سانس میرے مُنہ سے چھو رہی تھی۔ بارش کے قطرے تیروں کی طرح کشتی پر پڑ رہے تھے لہریں ساحل سے ٹکرا رہی تھیں اور ہم دونوں سردی سے اکڑے ہوئے

اور کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔ اس ساری کیفیت پر مجاز کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا اور مجھے یقین ہے کہ آج تک کسی نے ایسا گراں بار اور ہولناک خواب کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ جیسی یہ حقیقت تھی۔

مگر نتاشا لگاتار ادھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھی —— ملاطفت اور ہمدردی کی باتیں، جیسی صرف عورتیں کر سکتی ہیں۔ اُس کی آواز اور الفاظ کے تاثرات ایک ہلکی سی آگ کی طرح میرے سینے میں سلگنے لگے اور میرا دل پگھلنے لگا۔

پھر آنسو میری آنکھوں سے طوفانی بارش کی طرح گذرنے لگے جنہوں نے بہت سی بدیوں، بہت سی حماقتوں اور بہت سے غموں کی گرد کو میرے دل سے دھو ڈالا، جو اس رات سے پہلے اُس پر جم رہی تھی، نتاشا مجھے تسلی دے رہی تھی۔

"بس، بس ننھے میاں اب چُپ ہو جاؤ، خُدا تمہیں اور موقع دے گا۔۔۔۔ تم اپنی اصلاح کر لوگے اور اپنے حقیقی مقام پر پھر کھڑے ہوگے۔۔۔۔ اور سب کام اچھے ہو جائیں گے۔۔۔۔۔"

اور وہ مجھے چومتی جاتی تھی، جس طرح ماں اپنے بچے کو چومتی ہے —— بے نفس اور بے غرض ہو کر۔

"بس اب چُپ ہو جاؤ —— مجھے تمہاری صورت دیکھ کر ہنسی آرہی ہے صبح ہونے دو، میں تمہارے لئے آپ کوئی جگہ تلاش کروں گی، اگر تم

نہیں کر سکے۔" اُس کی یہ پُرسکون اور ہمت افزا سرگوشیاں میرے کانوں میں اسطرح گونج رہی تھیں جیسے یہ کوئی خواب ہو،

صبح ہونے تک ہم وہیں پڑے رہے .....

اور جب صبح ہوئی، ہم کشتی کے پیچھے سے نکلے اور شہر کو چلے گئے .... پھر ہم نے ایک دوسرے سے دوستانہ طریق پر رخصت حاصل کی اور اسکے بعد کبھی نہ مل سکے، گو پورے چھ ماہ تک میں نے اُس ہمدرد تماشا کے لئے شہر کا کونہ کونہ چھان مارا، جس کے ساتھ میں نے خزاں کی یہ رات گزاری تھی۔

اگر وہ مر چکی ہے اور اس کے لئے اچھا ہے اگر وہ مر چکی ہے ـــــ تو وہ ابدی نیند امن کے ساتھ سوئے۔ اور اگر وہ زندہ ہے تو پھر بھی میں یہی کہونگا کہ اُس کی روح پر سلام ہو اور اس کی رُوح کو کبھی دنیا کی پستی کا احساس نہ ہو ..... کیونکہ اگر زندہ رہنا ہے تو یہ احساس، زندگی کا ایک بے مصرف اور بے حاصل دُکھ ہے ۔